سلسلۂ اسلام اور مستشرقین

فروری سنہ ۱۹۸۲ء میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر دارالمصنفین کے اہتمام میں جو بین الاقوا[می] سمینار ہوا تھا، اس کے سلسلہ میں اسی عنوان پر دارالمصنفین نے ایک اہم اور نیا سلسلۂ تالیفات شروع کیا، جس کی اب تک پانچ جلدیں مرتب ہو چکی ہیں۔

جلد ۱ اس میں جناب سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کے قلم سے اس سمینار کی بہت مفصل اور دلچسپ روداد قلم بند ہوئی ہے۔ قیمت ۲۰ روپیے۔

جلد ۲ اس میں وہ تمام مقالات جمع کر دیے گئے ہیں جو اس سمینار میں پڑھے گئے تھے جو معارف سنہ ۸۲ء سے لے کر سنہ ۸۳ء تک سلسلہ وار شایع بھی ہو چکے ہیں۔ قیمت ۳۳ روپ[یے]

جلد ۳ اس میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر سمینار کے علاوہ جو مقالات لکھے گئے ہیں اور معارف میں شایع بھی ہو چکے ہیں، جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۳ روپیے۔

جلد ۴ تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر مستشرقین کے اعتراضات کے جواب میں علامہ شبلی نعمانیؒ کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۳۳ روپیے۔

جلد ۵ اسلامی علوم و فنون سے متعلق مستشرقین کی قابل قدر خدمات کے اعتراف کے با[وجود] ان کے اسلام اور تاریخ اسلام کے مختلف پہلوؤں پر اعتراضات کے جواب میں مولانا سید سلیما[ن] ندوی کے تمام مضامین جمع کر دیے گئے ہیں۔ قیمت ۲۰ روپیے۔

"منیجر"

معارف اعظم گڈھ

کی

۱۴۷ ویں جلد

ماہ جنوری سنہ ۱۹۹۱ء تا ماہ جون سنہ ۱۹۹۱ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

فہرست

مضامین معارف

جلد ۱۴۷

ماہ جنوری ۱۹۹۱ء تا ماہ جون ۱۹۹۱ء

(بہ ترتیب حروف تہجی)

جلد ۱۴۷ ماہ جمادی الاخریٰ سنہ ۱۴۱۱ھ مطابق ماہ جنوری سنہ ۱۹۹۱ء عدد ۱

مضامین

معارف کا زر تعاون

ہندوستان میں — فی شمارہ ۴ روپے — سالانہ چندہ : ۴۰ روپے

پاکستان میں — سالانہ چندہ — سو روپے (۱۰۰)

" چندہ بھیجنے کا پتہ : حافظ محمد یحییٰ شیرستان بلڈنگ بالمقابل ایس۔ ایم کالج اسٹریچن روڈ کراچی پاکستان

بیرونی ملکوں میں ہوائی ڈاک سے سالانہ چندہ ۱۰ پونڈ یا ۱۶ ڈالر

" بحری ڈاک " " ۳ پونڈ یا ۵ ڈالر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

شذرات

گزشتہ کئی مہینوں سے بابری مسجد کو مندر بنانے کی جو مہم پورے زور و شور سے جاری ہے، پتہ نہیں اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس کی وجہ سے پوری دنیا میں ہندوستان کی رسوائی ہو رہی ہے اور اس کی رواداری، امن پسندی اور تمام مذاہب کے ساتھ عدم امتیاز کے بارے میں شک و شبہہ ظاہر کیا جا رہا ہے، خود ملک میں ہر طرف افراتفری مچی ہوئی ہے، کوئی شعبۂ زندگی بھی لاقانونیت اور انتشار سے خالی نہیں، ہر جگہ خوف و دہشت کا ماحول ہے، پُرامن شہریوں کی جان پر بن آئی ہے، مسلمانوں کے لیے اپنے گھروں سے نکلنا اور ناگزیر سفر کرنا بھی مشکل ہوگیا ہے، اتر پردیش میں جو آگ لگی ہوئی ہے اس کے شعلے رہ رہ کر بھڑکتے اور پورے پورے خاندانوں کو بھسم کر دیتے ہیں، معصوم بچوں کو چلتی ٹرینوں سے باہر پھینک دینا اور گاڑیوں کو روک کر بے گناہوں کا قتل عام کرنا فرقہ پسندوں کا معمول ہوتا جا رہا ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نہ ان میں کوئی مروت و شرافت رہ گئی ہے اور نہ تہذیب و شائستگی جو ہندوستان کا طرۂ امتیاز تھا۔

ہندوستان جنت نشان کہلاتا تھا، یہاں انسان تو در کنار جانوروں کو مارنا اور انھیں ایذا دینا گناہ سمجھا جاتا تھا، لوگ نفرت و عداوت، ظلم و تشدد اور وحشت و بربریت سے ناآشنا اور ہمدردی، رحم دلی، صلح و آشتی اور الفت و محبت کے دلدادہ تھے، عفو و درگذر سے کام لینا، اور اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دینا ان کی خصوصیت تھی، بُدھ جی سے لے کر گاندھی جی تک کے تمام رشیوں منیوں کی تعلیم و تلقین یہی تھی اور گاندھی جی نے تو ہندو مسلم اتحاد اور ملک کو خون خرابہ سے بچانے کے لیے اپنی جان ہی دے دی تھی، لیکن اب قومی ایکتا اور ہندو مسلم اتحاد خواب و خیال ہوگیا ہے، اور ظلم و تشدد اور وحشت و بربریت اپنی انتہا کو پہونچ گئی ہے، قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے، کسی کی جان و مال، عزت و آبرو اور عورتوں کی عصمتیں محفوظ نہیں ہیں، دوسروں کی دلآزاری، اور ان کی عبادت گاہوں کو ڈھا دینے میں خوشی محسوس کی جا رہی ہے اور کبھی اس پر غور نہیں کیا جاتا کہ

ان مجنونانہ حرکتوں سے آزاد ہندوستان کی تصویر کتنی بدنما ہوتی جا رہی ہے۔

یہ بجا ہے کہ ایودھیا کے واقعات کی مذمت بھی ہو رہی ہے، ان سے اکثریت کے انصاف پسند، معقول اور سنجیدہ لوگوں کے سر شرم سے جھک گئے ہیں اور وہ اس کھلی جارحیت اور انتہا پسندانہ رویہ کی مخالفت کر رہے ہیں، حکومت نے بھی آئین و قانون کو اپنے ہاتھوں میں لے کر خود سرکار روائی کرنے والوں کے ساتھ نرم رویہ اختیار کرنے کے باوجود ان کے معاملہ میں اپنی ذمہ داری نباہنے کی کوشش کی، اس نے متعدد بار اس پر زور دیا کہ باہمی گفت و شنید سے معاملہ طے نہ ہو تو عدالت کا فیصلہ تسلیم کیا جائے اور امن و امان کو باقی رکھا جائے، لیکن فرقہ پرستی کا امنڈتا ہوا سیلاب بابری مسجد سے ٹکرا کر رہا اور نفرت و تشدد کی آگ بھڑکانے والوں نے اسے نقصان پہونچا کر اور اس کے تقدس کو پامال کر کے ہی دم لیا، اس غیر آئینی اور سراسر جارحانہ اقدام کے خلاف حکومت کو حرکت میں آنا پڑا، جس کے نتیجے میں چند افراد ہلاک ہوگئے۔

یہ امر افسوسناک ضرور ہے، لیکن حکومت کے سامنے اس کے علاوہ اور کوئی راستہ ہی نہیں رہ گیا تھا، جب اس کی ہر فہمایش رد کر دی گئی تو تشدد اور بغاوت پر آمادہ لوگوں کے خلاف وہ اس کے سوا اور کون سا قدم اٹھاتی، جو لوگ قانون کی بالادستی کو ختم کر کے اور ملک کو برباد کر کے اپنی قیادت چمکانے کے سوا کسی اور بات پر راضی نہیں تھے، کیا وہ کسی نرمی اور رعایت کے مستحق تھے مگر اس کے باوجود انھیں بے قصور کہا جا رہا ہے اور ایودھیا کے واقعات کی عدالتی تحقیقات اور "شہیدوں" کو معاوضہ دیے جانے کے لیے اصرار کیا جا رہا ہے، یہ مطالبہ فرقہ پسندوں کی جانب سے ہوتا تو تعجب نہ ہوتا، لیکن ان کے سُر میں سُر ملانے والوں میں وہ لوگ بھی شامل ہو گئے ہیں جن کو اپنی انصاف و معقولیت پسندی پر ناز ہے کیا بابری مسجد کو ڈھا کر چین ملتا؟

ملک میں آئے دن فسادات ہوتے ہیں جن میں بے شمار بے گناہ مارے جاتے ہیں، مگر کسی کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی، خود بابری مسجد اور رام جنم بھومی کے تنازع کے نتیجہ میں گھر کے گھر

اور بستی کی بستی کا صفایا ہوگیا، بارہ بنکی میں معمولی احتجاج کرنے پر لوگ گولیوں کا نشانہ بنا دیے گئے مگر نہ ان کے معاوضہ کی بات ہوئی اور نہ عدالتی تحقیقات کے مطالبہ نے زور پکڑا، اگر ایودھیا میں ظلم و زیادتی کا راستہ اختیار کرنے والے تحسین و آفریں اور انعام و اکرام کے مستحق ہیں تو پنجاب اور کشمیر کے دہشت گردوں کے بارے میں کیا کہا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ ملک اس وقت بہت نازک اور بحرانی دور سے گذر رہا ہے، فرقہ پرست اور رجعت پسند عناصر نے مذہب کے نام پر سیاست کا کاروبار شروع کرکے ملک کو بہت پیچھے کر دیا ہے، اگر یہ سلسلہ جاری رہا تو ملک کی وحدت و سالمیت باقی نہیں رہ جائے گی اور اسکی دیرینہ نیک نامی اور ہزاروں برس پرانی روایات خاک میں مل جائیں گی، اس وقت محب وطن دانشوروں اور اخلاق و اقدار کے پاسبانوں کو آگے بڑھنا چاہیے اور ملک کے وسیع تر مفاد میں فرقہ پرستی کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے اور نفرت و تشدد کے بھڑکتے شعلوں کو بجھانے کے لیے کمربستہ ہو جانا چاہیے، یہ صرف ایک مسجد اور مسلمانوں کا معاملہ نہیں ہے، بلکہ ملک و قوم کی بربادی کا پیش خیمہ ہے، ایسے اہم اور نازک معاملہ میں خاموشی و بے پروائی جرم ہے، جس کی تلافی ممکن نہ ہوگی، ارباب سیاست سے سیدھے سادے لوگ گھبرا اٹھے ہیں، ان کے خطرناک کھیل سے نیک طینت اور دور اندیش دانشور ہی ملک کو بچا سکتے ہیں ؎

پرانی سیاست گری خوار ہے زمیں میر و سلطاں سے بیزار ہے

شذرات کی کتابت ہو چکی تھی کہ پروفیسر مختار الدین احمد علی گڑھ کے مکتوب گرامی سے قاضی سجاد حسین صاحب صدر مدرس مدرسہ عالیہ فتحپوری دہلی کے انتقال کی خبر ملی، ان پر آیندہ نمبر میں پروفیسر صاحب کا مضمون شایع ہوگا، ڈاک کا نظام اتنا خراب ہے کہ خطوط بہت تاخیر سے اور اخبارات سرے سے نہیں ملتے۔

مقالات

دیوان معین الدین کے بارے میں کچھ گذارش

از

پروفیسر نذیر احمد۔ علی گڑھ

یہ دیوان جس کا ذکر اس مقالے میں آرہا ہے، حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کے نام سے نول کشور پریس میں شعبان ۱۲۸۵ھ مطابق ۱۸۶۸ء میں طبع ہوا تھا، اس کے کچھ قلمی نسخے بھی حضرت خواجہ کے نام سے ملتے ہیں، اور گیارہویں اور بارہویں صدی ہجری کے بعض تذکروں میں حضرت کے نام سے اور بعض میں معین مسکین ہروی کے نام سے یہ دیوان منسوب ہوا ہے، لیکن اس کا انتساب حضرت کی طرف غلط ہے، یہ معین مسکین ہروی کا ہے، جیسا کہ حافظ محمود شیرانی نے رسالہ اردو بابت ماہ جولائی ۱۹۲۴ء میں واضح دلائل سے ثابت کر دیا ہے، معین الدین فراہی ہروی کا لقب ملا مسکین تھا جو معین الدین واعظ کے نام سے بھی جانے جاتے ہیں، معین الدین شاعر تھے اور معین، معین مسکین، معینی، مسکین معینی تخلص کرتے تھے، وہ بڑے درجہ کے واعظ تھے، اور زندگی کا بڑا حصہ انھوں نے وعظ و تلقین میں صرف کر دیا تھا، علاوہ دیوان کے وہ متعدد تصانیف کے مالک ہیں، جن میں معارج النبوۃ سب سے زیادہ مشہور[1] ہے، مصنف اس کتاب کی تصنیف میں ۸۹۱ھ

---

[1] یہ کتاب کم از کم چار بار لکھنؤ، لاہور، لاہور، کانپور اور بمبئی سے طبع ہو چکی ہے۔

سے ۸۹۶ھ تک مصروف رہا، ۸۹۶ھ کے اس کے ایک نسخے کا ذکر C. A. Story نے پرشین لٹریچر میں کیا ہے، ان کی دیگر تصانیف میں تفسیر سورۂ فاتحہ، تفسیر سورۂ یوسف بنام حدائق الحقائق، اعجاز موسوی جو تاریخ موسوی وغیرہ ناموں سے مشہور ہے، قابل ذکر ہیں، معین ہروی نے اپنی اکثر تصانیف کا ذکر اپنی کتابوں کے مقدمے میں کر دیا ہے، ان کی تصانیف کی منجملہ اور خصوصیات کے ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں وہ اپنے کافی اشعار نقل کرتے ہیں، کبھی "لمؤلفہ"، کبھی "فقیر گوید"، کبھی "فقیر تو گوید" کے فقرات کے ساتھ، جن سے ان اشعار کی نسبت خود ان کی طرف مسلم ہو جاتی ہے، حافظ محمود شیرانی نے ان کی چند کتابوں میں ایسے اشعار کی نشاندہی کی ہے جو "دیوان معین الدین" میں شامل ہیں۔

یہ وہ زبردست قرینہ ہے جس سے یہ بات یقین کے درجے پر پہونچ جاتی ہے کہ یہ دیوان معین ہروی کا ہے، اور چونکہ آخر الذکر نے ایک دو بار نہیں بیسیوں بار دیوان کی متعدد غزلیں اپنی نثری تصانیف میں اپنے نام سے درج کی ہیں تو ان کے دیوان معین الدین کے مالک ہونے میں کون سا شبہہ باقی رہ جاتا ہے، حد یہ ہے کہ صرف ایک دو کتابوں میں نہیں بلکہ ان کی جملہ تصانیف میں دیوان میں مندرج غزلیں نقل ہیں، اور ایسا بھی ہے کہ بعض غزلیں بتکرار درج ہوئی ہیں، ادبی تحقیق میں اس طرح کے شواہد کہ خود مصنف اپنی تصنیف کا شاہد[1] ہو، بہت ہی شاذ ہیں۔

یہ تو ہی ایک بات، دوسری اہم بات یہ ہے کہ دیوان کی متعدد غزلوں میں وہ اپنے کو معین مسکین کے نام سے یاد کرتے ہیں، مثلاً

مسکین معین در ہر درے زاں لعل دیگر گوں زند (دیوان مطبوعہ ص ۲۵)

[1] دیوان میں شامل غزلوں کے بارے میں اپنی ملکیت کا بیان پورے دیوان کی ملکیت کا ثبوت ہے۔

جلوۂ مسکیں معین بر تاج و منبر کردہ اند (ص ۳۴)

مسکین معینی تاکنوں در شام غم ماندہ زبون (ص ۳۲)

گر دل مسکین معین از جادو و معذور دار (ص ۳۹)

از غمت مسکین معین ہر دم بدردے مبتلاست (ص ٦٦)

چوں دل مسکین معیں آیینہ تست اے کریم (ص ۷٦)

گنگ شد مسکین معین ہم خود ثنائے خود بگو (؍؍)

مسکین معین در یک غزل بنمود اسرار ازل (ص ۸۰)

یہی فقرہ مسکین معین یا معین مسکین، معین الدین فراہی کی نثری تصنیف میں برابر ملتا ہے، مثلاً حدائق مطبوعہ تہران ص ۲:

بندۂ ضعیف مسکین معین الدین

نسخۂ موزۂ ملی پاکستان کراچی

بندۂ ضعیف مسکین معین (دیکھیے فہرست ص ۱)

نسخۂ حدائق الحقائق = بحر الدرر، نسخۂ موزۂ ملی پاکستان کراچی

بعدہٗ می گوید بندۂ ضعیف معین مسکین (فہرست ص ۵)

نسخہ رسالہ نعت احمد، شیفتہ $\frac{58}{14}$ کتابخانۂ دانشگاہ علی گڑھ۔

ورق ۱ ب: خلائق ہژدہ ہزار عالم از اہل آسمان و زمین

تخصیص معین مسکین غلام و چاکر اوست

تفسیر حدائق الحقائق کے سرورق پر ان کا نام اس طرح ملتا ہے: معین الدین فراہی ہروی مشہور بہ ملا مسکین۔

اس توضیح سے ظاہر ہے کہ معین مسکین جو مندرجۂ بالا کتابوں کا مصنف ہے وہی دیوان کا بھی ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ متعدد غزل میں معین الدین کا تخلص معینی آیا ہے، مثلاً:

ہرچہ خواہی با معینی میش بہ از لطف و مہر (ص ۶)

تقصیر معینی کہ بنا بر کرم اوست (ص ۹)

بر معینی ہمہ معلوم بہ اعلام دلست (ص ۱۱)

گر معینی بیش ازیں گفتی زحسنش شمۂ (۱۲)

خموش باش معینی و دم مزن ہمہ اوست (۱۳)

در باغ و بوستانم دیگر مخواں معینی (ص ۲۱)

یہی تخلص معینی بعض ان غزلوں میں آیا ہے، جو معین الدین فراہی کی نثری تصانیف میں درج ہیں، اور مطبوعہ دیوان سے خارج، مثلاً تاریخ موسوی (عبدالسلام کلکشن ۱/۱) کتاب خانہ دانشگاہ علی گڑھ ورق ۲۷ ب پر یہ غزل[1] درج ہے:

اگر بوادی ایمن بروں بری راہی — تو ہم زخود شنوی نعرۂ انا اللّٰہی!

زقید تن بدر آ و فضائے عالم جان — ببیں ز روزن دل تا بحضرتش راہی

بظلمت شب ہجراں ز مطلع غیبی — عجب مدار کہ سر برزند یکے ماہی

زچشمۂ دلت آب حیات بر جو شد — چنانکہ طلعت یوسف بر آمد از چاہی

تو غافلی چہ شناسی ز سر نور وجود — کہ نیست مظہر آں جز ضمیر آگاہی

حجاب ظلمت نور از میانِ تو برداشت — اگر ہزار بود فی المثل یکی آہی

[1] یہ غزل مطبوعہ نسخہ میں نہیں، لیکن نسخہ دیوان عبدالسلام کلکشن ۵۵/۲۲ ورق ۹۵ ب پر موجود ہے

بر باغ قدس بہر دم گلی دگر شگفد — ازاں نفس کہ بر آید ز دل سحرگاہی

برفت جان ز معینی و تن بکوئے تو ماند — کہ تا بگان تو یادی کند گہی گاہی

مزید حشمت و جاہ است اگر زروئے کرم — گہی تفقد حال گدا کند شاہی

حدائق الحقائق ص ۶۸۴ پر معینی تخلص کی یہ بیت ملاحظہ ہو جو مطبوعہ[1] دیوان میں نہیں ہے:

معینی دیدۂ غیرت ببست از دیدن غیرت — مگر ایں چشم پُر حیرت بدیدار تو بکشاید

ذیل میں معین فراہی کی چند کتابوں سے ان کے اشعار نقل کیے جاتے ہیں جن میں سے متعدد نظمیں دیوان میں موجود ہیں:

رسالہ نعوت احمد

نسخۂ خطی، شیفتہ کلکشن ۵۵/۱۳ ورق ۴۱، ۱۵ سطری خط نستعلیق مائل بہ نسخ، ناقص الطرفین: ابتدا:

ازشمائم رایحۂ روح پرور ... خلائق ہژدہ ہزار عالم از اہل آسمان و زمین بتخصیص معین مسکین غلام و چاکر اوست .. صلی اللہ علی خیر خلقہ محمد و آلہ اجمعین۔

ورق ۱۷۔ ای تو سلطانِ دارِ ملک وجود، ہمہ عالم طفیل تو مقصود

یہ غزل مطبوعہ دیوان ص ۲۱ - ۲۲ پر موجود ہے، خطی نسخے میں ایک بیت زیادہ ہے، مقطع میں دونوں میں تفاوت ہے:

می فرستد معین بخدمت تو صدہزاراں درود نامعدود	می فرستد مسکین درود بتو حق تعالیٰ شود ز من خوشنود

[1] قلمی نسخے میں بھی نہیں پائی جاتی ہے۔

ورق ۱۹ ب۔ عالم نمی از ترشحہ بحر کرم اوست ٭ آدم کف خاکی ز غبار قدم اوست

یہ غزل مطبوعہ نسخے میں ص ۸ - ۹ پر ہے، اس کی دوسری بیت :

آدم شدہ بیدار و ہنوز او بہ شکر خواب   شاباش وجودی کہ طفیل عدم اوست

خطی نسخے میں نہیں ہے، مقطعے دونوں کے ایک ہیں :

داریم امیدی کہ بپرسند بہ محشر   تقصیر معینی کہ بنا بر کرم اوست

ورق ۲۶ و در دل چو کرد منزل جاناں یا محمد   صد در کشاد در دل از جان یا محمد

مطبوعہ کی حسب ذیل بیت خطی نسخے سے غائب ہے :

امروز خون عاشق در عشق اگر ہدر شد   فردا ز دوست خواہد تاوان یا محمد

مقطع دونوں میں یہ ہے :

در باغ و بوستانم دیگر مخواں معینی   با غم بس است قرآن بستان یا محمد

ورق ۳۰ و :

پیش ازاں کاستاد فطرت فرش ایوان ساختہ ٭ پایۂ قدرت فراز کون و امکان ساختہ

اس میں نسخۂ خطی میں دس شعر ہیں، جبکہ مطبوعہ میں پندرہ شعر ہیں، اس کے پانچ شعر زائد یہ ہیں: (ص ۸۱ - ۸۲)

ہمچو بسم اللہ بر منشور قرآنت خدای الخ

اہ بداں عنوان در حمت کردہ ظاہر اندریں الخ

دشمناں از کیں تو بر نار حرماں سوختہ الخ

نار نمرودی بر ابراہیم گرشد گلستاں الخ

بہر فرزند خلیل ار گوسفند آمد فدا الخ

مقطع یہ ہے :

رحمۃ للعالمینی بر معینی رحم کن   کز جہالت خویش را محکوم شیطان ساختہ

قصۂ حضرت موسیٰ / اعجاز موسوی

نسخۂ خطی، عبدالسلام کلکشن (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ لائبریری) - ۱/۲ ورق ۱۲۰، تقطیع کلاں، ۲۱ سطری نستعلیق جدید، اس کے اور نام ہیں: اعجاز موسوی حالاتِ موسوی، یہ نسخہ چھپ چکا ہے، لیکن میرے پیش نظر قلمی نسخہ ہے :

ورق ۲۷ ب لمولفہ فی ہذا المعنیٰ

آتشی آمد پدید و جسم و جاں یکسر بسوخت   دل درون سینہ ام چوں عود در مجمر بسوخت

اس میں سات بیت ہیں، مطبوعہ نسخہ میں یہ غزل ص ۱۲ - ۱۳ پر ہے اور اس میں بھی سات ہی بیت ہیں، مقطع یہ ہے :

خلق گویندم معین ایں رمز بر منبر مگوی   آہ کیں آتش ہزاراں واعظ و منبر بسوخت

۱۴ الف ابیات لمؤلفہ :

آتشی افروخت عشق و جسم و جان من بسوخت ٭ گفتم آہی بر کشم کام و زبان من بسوخت

یہ غزل مطبوعہ نسخے میں ص ۱۱ - ۱۲ پر نقل ہے، مطبوعہ میں ۱۱ شعر اور قلمی میں چھ شعر ہیں، خطی نسخہ میں ورق ۲۹ ب پر یہی غزل دوبارہ نقل ہے، چنانکہ فقیر گوید: آتشی افروخت عشق و جسم و جان من بسوخت الخ ۔ یہاں آٹھ شعر ہیں، مقطع یہ ہے :

گر معینی بیش ازیں گفتی ز حسنش شمۂ   ایں زماں نور رخش شرح و بیان من بسوخت

۲۷ الف فقیر را نیز دریں معنی سرّی بر خاطر خطور کردہ است، عرضہ می دارم :

اگر بوادیٔ ایمن بروں بری راہی   تو ہم ز خود شنوی نعرۂ انا اللّٰہی

اس میں نو شعر ہیں اور بیت تخلص یہ ہے :

برفت جان ز معینی و تن بکوئے تو ماند　　　　که تا سگان تو یادی کنند گهی گاهی

یہی غزل حدائق الحقائق مطبوعہ ص ۷۴ پر موجود ہے، اس میں سات شعر ہیں، یہ غزل مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں، البتہ قلمی دیوان، احسن گلگشن ۸۵/۲۲ ورق ۶۵ پر موجود ہے۔.

ورق ۶۸ الف　ابیات لمؤلفہ :

ترا می خواہم اے دلبر کہ می بینم　　　　توئی مقصود من در ہر کہ بینم

یہ مطبوعہ دیوان ص ۵۵ پر نقل ہے، قلمی اور مطبوعہ دونوں میں سات بیت ہیں، مقطع یہ ہے :

معین امروز می خواہد وصالش　　　　ندارد صبر تا محشر کہ می بینم

۶۸ ب　لمؤلفہ عفی عنہ :

محبوب خود ای عاشق از غیر چرا جوئی　　　　او را ہم از و بطلب گر مرد خدا جوئی

اس میں سات بیت ہیں، مقطع یہ ہے :

در گوش دلم ہر دم از غیب ندا آید　　　　گم کرد معین در خود گر زانکہ مرا جوئی

یہی غزل حدائق الحقائق میں ص ۱۴۱ پر اس طرح آئی ہے :

چنانکہ فقیر گوید : محبوب تو اے عاشق از غیر چرا جوئی الخ، اس میں صرف ۴ بیت درج ہیں، لیکن یہ غزل مطبوعہ نسخہ میں نہیں ہے، البتہ قلمی نسخے احسن گلگشن ورق ۶۵ ب پر موجود ہے۔

۶۸ ب　لمؤلفہ :

من از آں دیدہ کہ دیدار نہ بینم چہ کنم　　　　من از آں یار کہ اغیار گزیند چہ کنم

اس غزل کے صرف چار شعر یہاں نقل ہیں، اور یہ غزل مطبوعہ نسخے میں شامل نہیں ہے، البتہ قلمی نسخے (احسن گلگشن ورق ۴۲ الف) میں نقل ہے۔

۷۰ الف　لمؤلفہ عفی عنہ :

کجاست آہ سحرگاہ و نالۂ دل شب　　　　خزینہ ہاست مرا پُر ز نقد علم و ادب

اس کے تین شعر نسخۂ خطی میں آئے ہیں، دو بیت یہ ہیں :

مباش تشنہ لب اندر بہ وادئ عصیاں　الخ

نظر بہ رحمتِ ما کن مخور فریب عمل　الخ

مطبوعہ نسخے میں ۱۱ ابیات ہیں، گویا ۸ بیت زائد (دیکھیے دیوان ص ۷-۸)

۷۲ الف　ہر کرا روز ازل رزقی بمقدر کردہ اند ؛ در برائے ہر کسی کاری مقرر کردہ اند

کل ۷ بیت ہیں، مطبوعہ (ص ۳۳) میں ۱۶ بیت، بیت موجودہ ۱، ۲، ۴، ۶، ۷، ۸، ۹ ہیں۔

۷۴ب، مندرجۂ بالا غزل کے تین شعر یہاں درج ہیں ۱، ۲، ۶۔

۷۴ ب، چناں از روزن دل نور آں دلدار می تابد

کہ خورشید جمالش از در و دیوار می تابد

خطی نسخہ میں صرف ۶ شعر، مطبوعہ دیوان ص ۳۵ میں ۱۴ شعر، خطی کے اشعار یہ ہیں : ۱، ۲، ۳، ۶، ۹، ۱۰۔

۷۵ الف　لمؤلفہ

یارب ایں صورت کہ در مرآۃ جہاں پیدا ست کیست ؛ آنچناں حسنی دریں پردہ نہاں پیدا ست کیست

خطی نسخے میں ۵ بیت اور مطبوعہ میں ۷، خطی نسخے کی یہ بیت مطبوعہ نسخے سے خارج ہے

ئے کہ حسن او نمی بینی مرا معذور دار   مہبط انوار حسنش در جہاں پیدا ست کیست

مطبوعہ نسخے کی بیت سوم و پنجم و ہفتم خطی میں نہیں۔

۷۵، ب۔ لمؤلفہ

ہر نظر در خورد دیدارش نیست   ہر دلی واقف دیدارش نیست

لمعۂ نور تجلی است قوی،   دیدہ را طاقت انوارش نیست

کو کند در رخ خورشید نظر   گر نہ آئینۂ رخسارش نیست

چونکہ خورشید رخش جلوہ کند   ذرۂ کو کہ ہوا دارش نیست

یہ غزل مطبوعہ نسخے میں شامل نہیں، اور احسن گلکشن کے نسخۂ خطی اور دوسرے ایک اور خطی نسخے میں نہیں پائی جاتی۔

۷۵ ب، لمؤلفہ

سر زلف عنبریں را بہ کرشمہ تاب دادی   ز تنم قرار بردی بہ دل اضطراب دادی

ز نقاب تو بر شکم کہ برخ فرو گذاری   کہ چرا فروغ رویت ہمہ با نقاب داری

ز فروغ نور رویت بہ جہاں خبر کہ دارد   کہ بہ ازاں نہ مہ نمودی نہ بہ آفتاب دادی

یہ غزل مطبوعہ نسخے سے خارج ہے، لیکن نسخۂ خطی احسن گلکشن ورق ۴۲ الف پر موجود ہے

۷۶ الف لمؤلفہ

پردہ بکشای کہ جاں عزم تماشا دارد   نظری در رخت از دور تمنا دارد

دیدہ را خود چہ محل ہر کہ ترا می جوید   جان جدا سازد اگر دیدہ بینا دارد

مطبوعہ نسخے میں اسی ردیف و مشابہ قوافی کے ساتھ ایک دوسری غزل ہے جس کا

مطلع یہ ہے:

راہ بکشائے کہ دل میل بہ بالا دارد   پردہ برگیر کہ جان عزم تماشا دارد
(ص ۲۹)

اس سے ظاہر ہے کہ معین فراہی نے اس ردیف و قوافی میں دو غزلیں لکھی تھیں، یہ غزل نسخۂ خطی میں بھی نہیں ہے۔

۱۱۴ ب۔ لمولفہ

یا زدر[1] بر روی اصحاب طلب بکشاد باز   حیف بل من تائب اندر جہاں وردا دباز

شہر معمور دلم کز سیل ہجراں شد خراب   شد ز[2] معماری وصلت عاقبت آباد باز

از یمین و از یسار قلب من در تاخت عشق   عقل مغلوب آخر در خلاب افتاد باز

گفتمش عکس جمالت چوں مرا موجود کرد   تا بمانم زندہ زاں بویم[3] بباید داد باز

لمعۂ از پرتوِ نور تجلی زد علم   طور ہستی مرا برکند از بنیاد باز

گفت از ہستی من لاف از وجود من مزن   کی تواں کردن دکان بالاتر از استاد باز

مطبوعہ نسخے میں گیارہ بیت ہیں یعنی پانچ بیت زیادہ ہیں (ص ۴۰-۴۱)

حدایق الحقایق

یہ سورۂ یوسف کی مفصل تفسیر ہے، جو احسن القصص کے نام سے بھی مشہور ہے، اس کے نسخے عام[4] طور پر ملتے ہیں، تین[5] بار طبع ہو چکی ہے، پہلی بار تہران میں بنام احسن القصص جوینی بدستور بہرام میرزا، دوبارہ لکھنؤ میں ۱۹۰۵ء میں، اور تیسری بار تہران میں ۱۳۶۲ شمسی میں، اس کے سرورق پر یہ عبارتیں ہیں:

---

[1] خطی میں بار [2] مطبوعہ: شاید از [3] مطبوعہ: تو تم [4] کتاب خانہ گنج بخش لاہور میں اس کے احسن القصص نام سے گیارہ نسخے ہیں، دیکھیے فہرست ج ۱ ص ۴۸-۵۰۔

تفسیر حدایق الحقایق

(قسمت سورۂ یوسف)

تالیف

معین الدین فراہی ہروی مشہور بہ ملا مسکین .

بکوشش

دکتر سید جعفر سجادی

موسسہ انتشارات امیر کبیر تہران ۱۳۶۴

حدایق ص ۱۷ :

چہ سود دست طمع گر کنی ز خود کوتاہ   سزد کہ پای دریں انجمن دراز کنی

یہ بیت ایک غزل کی ہے جو مطبوعہ دیوان معین میں پوری موجود ہے ، اس کا مطلع یہ ہے ؎

اگر ز مستی خود چشم دل فراز کنی   تخست دیدہ بدیدار دوست باز کنی
(ص ۸۹)

لیکن حدایق میں "لمؤلفہ" کی قسم کی کوئی علامت نہیں ہے .

ص ۷۲ ، ابیات موافق حال :

دلی چو[1] یکی بیش نیست دوست یکی بس بود   واں یکی[2] بی اشتراک ذات مقدس بود
در صف قدوسیاں آنکہ دریں تیرہ[3] خاک   قبلۂ جان و دلش حضرت اقدس(ا) بود
بوالہوساں را ز عشق لاف زدن کی سزد   طعمۂ عنقا کجا درخور کرگس بود
بر سر کیواں زند نوبت شاہنشہی   گنج نہانی عشق در دل ہر کس بود

[1] ص ۵۸۸ : چہ [2] ص ۵۸۸ : یک [3] ص ۶۷ : دیر

ہر کہ ازیں سطح خاک پا سوئے بالا نہد   پایۂ ادنای[1] او قاف مقرنس بود ؟
گلخنی فقر را در تہ پہلو معین   بستر خاکستری مفرش اطلس بود

اسی غزل کے پہلے چار شعر ص ۵۸۸ پر "لمؤلفہ" کے عنوان سے درج ہیں ، لیکن یہ غزل موجودہ دیوان سے خارج ہے . دیوان نسخہ خطی (احسن گلکشن ورق ۱۶۶ ا) میں شامل ہے .

ص ۲۰۷ : لمولفہ .

چوں چشم[2] از غیر بربندی ہمہ دیدار او بینی   ز ذرات جہاں تاباں ہمہ انوار او بینی
ز مرآت جہاں باری تواں عکس رخش دیدن   اگر بے پردہ نتوانی کہ در رخسار او بینی
درون قصر دل در رو کہ تا از وی خبر یابی   بستر خود نکو بنگر کہ تا اسرار او بینی
توئی ظاہر توئی مظہر توئی ناظر توئی منظر   بہ جیب خود فرو کن سر کہ تا دیدار او بینی

یہ غزل دیوان معین سے خارج ہے ، لیکن معین فراہی کی ملکیت میں کسی شبہے کی گنجایش نہیں ، دیوان نسخہ خطی احسن گلکشن (ورق ۱۴۴ ب) میں پائی جاتی ہے .

ص ۲۰۶ ، اس صفحے پر ایک غزل کے ، جس کا مطلع حسب ذیل ہے ، تین شعر نقل ہیں ، مگر یہاں کوئی علامت نہیں جس سے اس غزل کی نسبت معین فراہی کی طرف معلوم ہو ، لیکن اسی غزل کے چار شعر ص ۳۴۹ - ۳۵۰ "لمولفہ" کی قید سے درج ہیں ، پھر اسی غزل کے دو شعر ص ۵۰۴ پر "لمؤلفہ" کے عنوان سے درج ہوئے ہیں : مطلع :

مراد در دل بغیر از دوست چیزے در نمی گنجد   بخلوت خانۂ سلطاں کسی دیگر نمی گنجد

یہ غزل مطبوعہ دیوان میں موجود ہے (ص ۴۵) اور اس میں ۱۱ شعر ہیں ، دیوان کے

[1] کذا فی الاصل نسخہ خطی : او تار [2] عرفی کے ایک مشہور قصیدے کا مطلع یہ ہے :

ز خود گر دیدہ بربندی چہ گو یم کام جاں بینی   ہماں کز اشتیاق دیدنش نادیدہ ہماں بینی .

دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ص ۲۰۶ پر پہلے تین شعر ص ۳۴۹ - ۳۵۰ پر پہلے ۴ شعر اور ص ۵۷،۴ پر پہلے دو شعر درج ہوئے، غزل میں آخری سات شعر زائد ہیں، ان اشعار کے بار بار معین الدین فراہی کی تفسیر میں خود ان کے نام سے درج ہونے کی بنا پر ان کا انتساب ہر قسم کے شبہہ سے پاک[1] ہے۔

ص ۲۵۶ :

گہی از رخِ تاباں نقاب زلف کشائی[2] 　 ز عاشقاں بنگاہی ہزار دل . ربائی

اس غزل کی دو اور ابیات نقل ہیں، یہ تینوں ابیات ان کی ایک غزل کی مطبوعہ دیوان ص ۹۱ پر درج ہیں، مطلع یہ ہے:

گہے از رخ تاباں نقاب زلف کشائی 　 ز عاشقاں بنگاہے ہزار دل ربائی

ص ۲۵۷ : چنانچہ نقیر تو می گوید :

از مطلع دل زد علم یک لمعہ از رخسار تو 　 شد ذرہ ذرہ ہستیم در پرتو[3] انوار تو

اس غزل کے یہاں دس شعر نقل ہیں، دیوان مطبوعہ (ص ۷۹ - ۸۰) میں اس کے ۵ اشعر منقول ہیں، مقطع یہ ہے:

مسکین معین در یک غزل بنمود اسرار ازل 　 بشنو کلام لم یزل در کسوت گفتار تو

واضح ہے کہ یہ غزل معین مسکین کی ہے، اور یہ اس بات کا بین ثبوت فراہم کرتا ہے کہ یہ دیوان معین مسکین فراہی ہروی کا ہے۔

ص ۳۱۹ لمؤلفہ :

---

[1] غزل کا مطلع ص ۶۰۷ حاشیہ میں درج ہے [2] مطبوعہ نسخے میں سارے قوانی بغیر یائے تنکیر کے ہیں (کشائے، ربائے وغیرہ) جو املا کے اعتبار سے غلط ہیں [3] مطبوعہ : پردہ

ز دوگانی کہ مرا یار سوی خویش کشید 　 دست در گردن ما کرد و مرا پیش کشید

باوجود ہمہ شاہان کہ گدایان ویند 　 رقم عشق بنام من درویش کشید

ہمہ کس طالب یار ند ولی چہ تواں کرد 　 کہ دلش جانب ایں خستہ دلاں بیش کشید

یہ غزل دیوان سے خارج ہے لیکن قلمی نسخے میں موجود ہے (رک، نسخہ احسن کلکشن ورق ۶۲ الف)

ص ۳۴۳ لمؤلفہ[1] :

بیا ساقی و مستاں را بہ میخانہ صلا در دہ 　 من دردی کش دیرینہ را جام صفا در دہ

نمی خواہم می فانی کہ در آخر خمار آرد 　 اگر تو می دہی باری از آں جام بقا در دہ

چو ساقی در خور ہر کس می اندر جام می ریزد 　 اگر دُرد است اگر صافی بداں قسمت رضا در دہ

گل شادی ہمی خواہی ز خار غم مکش دامن 　 قدم گر طالب گنجی بکام اژدہا در دہ

عروج جان اگر خواہی بہ اوج طارم ہفتم 　 قدم بر فرق ہستی زن دو عالم را صلا[2] در دہ

یہ غزل مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں لیکن قلمی نسخے میں شامل ہے (ورق ۵۶ الف) لیکن بلاشبہہ معین ہروی کی ہے، اس کی تین بیت حدائق ص ۶۸۷ پر درج ہیں۔

ص ۳۷۸، چنانچہ فقیر تو می گوید :

گر کشائی دیدۂ دل حسن او بینی ہمہ 　 ور ببندی دیدۂ بد بین نکو بینی ہمہ

آفتابی را کہ اندر روزن دل تافتہ است 　 با ہمہ ذرات عالم روبرو بینی ہمہ

ناظر حق باش در مرآت ذرات وجود 　 تا دریں آئینہ ہا دیدار او بینی ہمہ

---

[1] یہ غزل دیوان قلمی عبدالسلام ۵۵/۲۲ کتابخانہ علی گڑھ ورق ۵۶ پر ہے۔

[2] اصل : صفا، لیکن اسی کتاب میں ص ۶۸۷ میں صلا ہے۔

عکس روی است آنکہ می تابد ز آئینہ نہ روی   آئینہ بر دار تا خود جملہ رو بینی ہمہ
زگلستان معانی یک گلت نامد بدست   بسکہ در گلزار صورت رنگ و بو بینی ہمہ
بادۂ وحدت بہر ظرفی نمی گنجد معین   نیست ایں زاں می کہ در خم و سبو بینی ہمہ

یہ غزل مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں، میرے مطالعہ کے دونوں قلمی نسخوں میں بھی نہیں ہے۔

ص ۳۸۴

بیا در بزم "او ادنیٰ"[1] یکی[2] رمزی ز من بشنو   وزاں اسرار "او اوحیٰ"[3] عجب طوطی[4] سخن بشنو

اس کی چار ابیات حدایق الحقایق میں آئی ہیں، دیوان میں ۷ بیت ہیں، ۴، ۶، ۷، حدایق میں نہیں، (دیوان مطبوعہ ص ۷۸)

ص ۴۷۰ : لمؤلفہ عفی عنہ

اگر بوادی ایمن برون بری را ہی   توہم ز خود شنوی[5] معنی انا اللّٰہی

یہاں اس میں سات بیت اور اعجاز موسوی یا قصۂ موسیٰ، نسخۂ کتابخانہ علی گڑھ، ورق ۲۷ (میں ۹ بیت ہیں، یہ غزل مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں، اس کو اس مقالے کے شروع میں نقل کر دیا گیا ہے، اسی حدایق ص ۶۴۲ میں اس غزل کے ۵ شعر منقول ہیں میرے مطالعے کے ایک قلمی نسخے میں موجود ہے (احسن گلگشن ورق ۶۴ ب)

ص ۴۸۰ :

من خود[6] ز اہل دلم فانی نخواہم شد ز مرگ   چوں تو یدہ وصل می آید[7] چہ ترسم از اجل

---

[1] قرآن ۵۳ : ۹ [2] مطبوعہ : یکی حرفی [3] قرآن ۵۳ : ۱۰ [4] مطبوعہ : یکی طرز سخن ۔
[5] تاریخ موسیٰ یا اعجاز موسوی ۲۷ ا : نعرۂ [6] دیوان : چو از [7] دیوان : می آرد ۔

گر کند دست اجل قصر وجودم خشت خشت ٭ اصل بنیاد محبت ہیچ نپذیرد خلل

یہ دونوں بیت ایک غزل کی ہیں جو مطبوعہ دیوان (ص ۴۶ - ۴۷) میں اس مطلع کے ساتھ آئی ہے :

من درے بودم نہاں در قعر بحر لم یزل   عشق غواصانہ ام آورد بیروں زاں محل

ص ۴۸۲ لمولفہ

از دلم صورت آں خوب ختن می نرود   چاشنی شکر او ز دہن می نرود
باللہ ار شور کنم ہر نفسی عیب مکن   گر برفت از دل تو از دل من می نرود
جان پروانۂ مسکین زپی شعلۂ شمع   تا نہ سوزد پر و بالش ز لگن می نرود
ہمہ مرغان چمن ہر طرفی می پرند   بلبل از واسطۂ گل ز چمن می نرود
مرغ جان ہر نفسی بال کشاید کہ پرد   بر امید نظر دوست ز تن می نرود

یہ غزل مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں، دونوں قلمی نسخوں میں بھی دکھائی نہ دی۔

ص ۴۹۸ : لمولفہ

بہشت دیدن آں یار مہوش است مرا   بہشت بی رخ او عین آتش است مرا
اگر وصال تو یابم بہر کجا کہ روم   اگرچہ آتش دوزخ بود خوش است مرا
مگر وصال تو آبی چکاند م بر لب   کہ از فراق تو جاں در کشاکش است مرا

یہ غزل مطبوعہ دیوان میں نہیں ہے، البتہ دونوں قلمی نسخوں میں موجود ہے (دیکھئے احسن گلگشن ورق ۱۶۱ الف)

ص ۵۴۶ لمولفہ :

ہمچو خورشید کہ در آب زلالی دیدم   اندر آئینۂ جان عکس جمالی دیدم

اس کے صرف تین شعر یہاں درج ہیں، پوری غزل سات شعر کی مطبوعہ دیوان ص ۴۸ پر موجود ہے، یہ تینوں شعر دیوان میں نمبر ۱، ۲، ۴ ہیں، مقطع یہ ہے:

تا معین ذرہ صفت رفت پی نور ازل   نہ طلوع نہ غروب و نہ زوالی دیدم

ص ۵۴۵۔ لمؤلفہ

اگر از آئینۂ دل غلاف برخیزد   میان ظلمت و نور اختلاف برخیزد
اگر زعکس رخت لمعۂ فتد بہ دیر   زاہل کفر ہمہ اعتراف برخیزد
بیا ز پردہ برون آ و جلوۂ بنمای   کہ تا ز مومن و کافر خلاف برخیزد
بہر دلی کہ شود سر وحدتش مکشوف   حجاب ہا ہمہ زاں انکشاف برخیزد
عجب مدار کہ در وقت دیدن ساقی   تفاوت از قدح و درد صاف برخیزد
توہم[1] بہ بینی اگر آنچہ دیدہ سر معین   یقیں ز سر تو ہم ایں گزاف برخیزد
معین بعاجز مسکیں اعانتی فرمای   مگر ز عون تو ایں اعتساف برخیزد

یہ غزل مطبوعہ دیوان میں شامل نہیں، یہ دونوں قلمی نسخوں میں بھی نہیں ملی۔

ص ۵۸۰:

گر آہ آتش بار من یک شعلۂ بیرون زند   ایں آتش[2] گردوں علم بر گنبد گردوں زند

اس غزل کے تین شعر بدون ذکر شاعر یہاں موجود ہیں، یہ غزل سات بیت پر مشتمل مطبوعہ دیوان ص ۲۴ - ۲۵ پر موجود ہے، یہاں کے تینوں شعر ۱، ۲، ۵ نمبر پر ہیں۔

ص ۵۸۸ لمولفہ:

دل چو یکے بیش نیست دوست یکی بس بود   واں یکی بی اشتراک ذات مقدس بود

---

[1] آخری دو بیتیں حدائق کے دوسرے قلمی نسخے سے ماخوذ ہیں [2] دیوان آتش پنہاں۔

اس غزل کے چھ[1] شعر اسی کتاب کے صفحہ ۲۷ پر درج ہیں، ان میں سے ۴ یہاں ہیں، یہ غزل مطبوعہ دیوان سے خارج ہے، البتہ قلمی نسخوں میں موجود ہے، دیکھئے نسخۂ دیوان احسن گلکشن ورق ۱۶۶ الف۔

ص ۵۸۹:

دل در پی روی نکو میرفت ہر دم کو بکو   بنہاد قید زلف او زنجیر بر پای دلم

یہ شعر ایک غزل کا ہے جو مطبوعہ دیوان ص ۵۱ پر بمطلع ذیل نقل ہے:

ای نور عشقت تافتہ اندر سویدای دلم   بگرفتہ نور عشق تو پنہاں و پیدای دلم

اس میں نو شعر ہیں، اسی غزل کے حسب ذیل دو[2] شعر حدائق الحقائق کے ص ۵۹۲ پر درج ہیں:

موسیٰ دراں روزی کہ او از لن ترانی زخم خورد   دل ہیچ اندیشہ نکرد ای وای صد وای دلم
ہر کس ز خود آید بدر آں نہ خمش آید بر جگر   دل خوں ز خود آمد بدر او گشت جویای دلم

ص ۶۱۱:

خزین ہاست مرا پر ز نقد علم و ادب   کجاست آہ سحرگاہ و نالۂ دل شب
مباش تشنہ لب اندر بوادی عصیاں   کہ بحر رحمت ما موج می زند بر لب

یہ غزل ۱۱ شعر پر مشتمل دیوان (ص ۷ - ۸) میں موجود ہے، اس کے تین شعر قصۂ حضرت موسیٰ یا اعجاز موسوی ورق ۱۰۷ الف پر نقل ہیں۔

ص ۶۲۹ = لمولفہ:

می دمد بوی ندانم تا کدامیں بو است ایں   بوی عشق است اینکہ می آید ز نحوی[illegible] دوستاں

اس میں یہاں چھ بیت ہیں (۵ متن، ایک حاشیہ)، مطبوعہ نسخہ میں اس میں

۷ بیت ہیں (ص ۷۰) آخر الذکر میں مقطع یہ ہے :

بادۂ ہو چوں بیا ہو ریخت بر جان معین   از دلش تا عرش صد جا نعرۂ یا ہوس ایں

جبکہ حدائق میں دوسرا مقطع ہے :

در ریاض عشق بازی رایض از عون معین   نکہت جاں بخش آید دہ چہ رنگ و بوست ایں

حدائق میں درج ہونا قطعی ثبوت اس بات کا ہے کہ یہ معین فراہی ہروی کی غزل ہے نہ کسی دوسرے کی۔ اسی غزل کی اول تین بیتیں اسی کتاب کے ص ۷۴۱ پر بدون انتساب شاعر مندرج ہیں :

ص ۶۴۱ ، چنانکہ فقیر گوید :

محبوب تو ای عاشق از غیر چرا جوئی   او را ہم از و بطلب گر مرد خدا جوئی

اس میں ۴ بیت ہیں، اسی غزل کے چھ۶ شعر قصۂ حضرت موسیٰ ورق ۱۶۸ الف پر درج ہیں یہ غزل مطبوعہ دیوان میں نہیں، البتہ صرف احسن گلگشن والے نسخے میں موجود ہے، ورق ۶۵ ب دوسرے نسخے میں نہیں۔

ص ۶۴۳ :

بہر بلا کہ تو خواہی بیاز مای مرا   کہ در مشاہدۂ تو بلا نمی بینم

ز من بہر چہ کنی یاد را نسیم حقا   کہ ہر چہ از تو رسد جز عطا نمی بینم

یہ غزل دیوان (ص ۵۳) میں موجود ہے، اس میں ۸ بیت ہیں اور مطلع و مقطع یہ ہیں

صفات و ذات چو ہم از جدا نمی بینم   بہ ہر چہ می نگرم جز خدا نمی بینم

عروج جان معینی بہ اوج "او ادنیٰ"   بجز متابعت مصطفیٰ نمی بینم

ص ۶۴۳ : در کوی بدنامی مرا پیوند شد با دلبری : ای خرقۂ ناموس من گو صد ہزاراں پارہ شو

یہ ایک غزل کی پانچویں بیت ہے، جو دیوان مطبوعہ ص ۷۷ پر پائی جاتی ہے، اس میں کل ۷ ابیات ہیں، مطلع یہ ہے :

نور تجلی می رسد ای طور دل صد پارہ شو   ای مرغ جاں بشکن قفس زیں خاکداں آوارہ شو

ص ۶۷۵

تو خاصہ زمن باش کہ ما نیز ترا ئیم   در ہر دو جہاں مقصد و مقصود تو ما ئیم

گر یک قدم از کوی طلب سوی من آئی   ما صد قدم از راہ کرم پیش تو آئیم

یہ معین کی ایک غزل کے دو۲ شعر ہیں جو دیوان (ص ۵۷) میں درج ہے اس میں دس۱۰ بیت ہیں اور مقطع یہ ہے :

از شش جہت کون گذشتست معینی   از جا چو برونیم چہ گوئیم کجا ئیم

ص ۶۸۴ : لمولفہ :

معینی دیدۂ عبرت ببست از دیدن غیرت   مگر ایں چشم پر حیرت بدیدار تو بکشاید

یہ شعر مطبوعہ و قلمی دونوں نسخوں میں نہیں ہے ۔

ص ۶۸۷ :

گل شادی ہمی خواہی ز خار غم مکش دامن   قدم گر طالب گنجی بکام اژدہا در دہ

وجودت چوں مس آمد کیمیائی عشق حاصل کن   بہ کانون غمش بگداز و آنگہ کیمیا در دہ

عروج جاں اگر خواہی بر اوج طارم وحدت   قدم بر فرق ہستی زن دو عالم را صلا در دہ

یہ غزل مطبوعہ دیوان میں نہیں، البتہ دونوں خطی نسخوں میں شامل ہے (ورق: ۵۶ الف) اس کے پانچ شعر حدائق ہی کے ص ۳۴۳ پر "لمولفہ" کے عنوان سے درج ہیں۔

ص ۴۲، لمؤلفہ :

چو چنگ می کشم این گوشمال وز خم فراق   مرادم آنکہ بہ بزم وصل بنوازی

اس غزل کی ۶ ابیات یہاں نقل ہیں، یہ غزل دیوان مطبوعہ ص ۸۶ - ۸۷ پر درج ہے، اس میں ۱۱ ابیات ہیں، پہلی دو بیت اور آخری تین بیت دیوان میں زائد ہیں مطلع و مقطع اس طرح پر ہیں:

چو از جمال نقاب بطون برندازی   دراں ظہور وجود مرا عدم سازی

معین بیک نظر از خاک برگرفتہ تست   بداں امید کہ باز از نظر بیندازی

ص ۴۳، لمؤلفہ :

نفحۂ عشق کزاں سوی جہاں می آید   بمشامِ دلم از عالم جاں می آید

اس غزل کی پانچ بیتیں یہاں نقل ہیں، دیوان میں ۱۷ ابیات ہیں (ص ۳۴-۳۵) مقطع دیوان میں آیا ہے:

آتش عشق تو در جان معین افتادست   وز دمش بوی دلِ سوختگان می آید

ص ۴۹، لمؤلفہ :

گر صبا از سر کوی دوست می آید   کہ از زمین و زمان بوی دوست می آید

اس غزل کے تین شعر یہاں درج ہیں، یہ غزل دیوان مطبوعہ ص ۲۶ پر موجود ہے اور اس جگہ کی تین ابیات کا نمبر ۱، ۲، ۵ ہے۔

ص ۵۳، لمؤلفہ عفی عنہ :

بوئی ز زلفش می دمد ای عقل شیدا شو رواں   باد بہاری می وزد چوں گل بصحرا شو رواں

زاں اقرب[1] از حبل الورید "یعقوب جاں بوئی شنید"   پیراہن یوسف رسید ای دیدۂ بینا شو رواں

[1] مستفاد از آیۂ قرآن: ونحن اقرب الیہ من حبل الورید۔

آہ جمالش جلوہ گر شد فاش اندر بحر و بر   چوں یافتی نور بصر سوئے تماشا شو رواں

زد آتش عشقش علم زاں جانب لوح و قلم   زیں فرش برتر نہ قدم بر عرش بالا شو رواں

در گوش جاں آمد ندا از بارگاہ کبریا   تو قطرۂ آبی بیا ہم سوئے دریا شو رواں

سوی نگار عشوہ گر، گر اتفاق افتد نظر   از عقل و دانش در گذر سرمست و شیدا شو رواں

از خویش و بیگانہ بجز، دستی بہر یاری مدہ   با خودی از خود بنہ درخویش تنہا شو رواں

از خویش چو تنہا روی از لا بسوی الّا روی   گر بایدت کانجا روی بیدست و بی پا شو رواں

چوں تو ز خود پنہاں شوی ہر چیز خواہی آں شوی   خواہی کہ تا جاناں شوی از غیر یکتا شو رواں

در روئے دریا چوں خسی گشتی تو سرگرداں بسی   خواہی معین گردی کسی زنہار باما شو رواں

معین الدین فراہی ہروی کی جو غزلیں صفحات بالا میں نقل ہوئی ہیں ان میں سے اکثر ان کے دیوان میں شامل ہیں، مطبوعہ میں البتہ بعض غزلیں نہیں ہیں جو قلمی نسخوں میں ملتی ہیں، اس سے یہ امر مسلم ہو جاتا ہے کہ دیوان جو حضرت معین الدین چشتی کے نام منسوب ہے وہ موصوف کا نہیں بلکہ ان کے ایک ہمنام معین فراہی ہروی کا ہے، جو حضرت سے تقریباً تین صدی بعد کے بزرگ ہیں، اور یہ قطعی شہادت اتنی وقیع ہے کہ فارسی ادب کی تاریخ میں اس طرح کی شہادتیں کبریت احمر کا حکم رکھتی ہیں۔

اس بحث مزید سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مطبوعہ دیوان کامل نہیں، اس میں نہ جانے کتنی غزلیں شامل ہونے سے رہ گئیں، معین ہروی نے مثنویاں اور رباعیاں بھی لکھی ہیں، کچھ مثنویوں کے اشعار ان کی نثری تصانیف[1] میں مل جاتی ہیں، لیکن جو سیکڑوں رباعیاں

[1] دیکھئے حدائق الحقائق ص ۱۹، ۲۱، ۲۶، ۸۵، ۳۵۰، ۴۰۵، ۴۸۳ وغیرہ، نیز اعجاز موسوی یا تحفۂ حضرت موسیٰ نسخہ کتبخانہ علی گڑھ ورق ۱۰۱ اب، رسالہ تنویر احمد نسخہ علی گڑھ ورق ۲۲۔

ان میں پائی جاتی ہیں، ان کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا۔

ایک قابل توجہ بات یہ ہے کہ دیوان معین کے دو[۲] نسخے مسلم یونیورسٹی کے کتابخانے میں موجود ہیں، پہلا عبدالسلام کلکشن ۵۵۵/۲۲، اوراق ۴۷، ۱۳ سطری، خط نستعلیق معمولی، تاریخ کتابت ۱۲۱۳ھ، دوسرا نسخہ ج ف ۲۲۲، اوراق ۸۸، سطریں مختلف، تاریخ کتابت ۱۲۳۹ھ جو مٹا دی گئی، پھر بھی پڑھی جا سکتی ہے۔

دونوں نسخوں کی ترتیب غیر الفبائی ہے، لیکن بالکل یکساں ہے، مطبوعہ نسخہ حروف تہجی سے ترتیب دیا گیا ہے، ان دونوں نسخوں میں صرف اتنا فرق ہے کہ ج ف والے نسخے میں پانچ غزلیں کم ہیں، قابل ذکر بات یہ ہے کہ ان دونوں قلمی نسخوں میں غزلوں کی تعداد مطبوعہ سے کہیں زیادہ ہے، تفصیل آگے آتی ہے اور جو غزلیں زیادہ ہیں وہ دو جگہ تسلسل کے ساتھ درج ہیں، ذیل میں دونوں مخطوطات کی اضافی غزلوں کے مطلعوں کے پہلے مصرعے درج کیے جاتے ہیں،

(از ورق ۳۹ ب تا ۴۳ ب۔ کل ۱۳ غزلیں)

۱. بوی زر زلفش می دمد ای عقل شیدا شو رواں

۲. ای آفتاب عرفان پُر نور دار ما را

۳. ای ز عشقت هر نفس در دل سرودی بیشتر

۴. هر نکته کز دقائق اسرار جلوه کرد

۵. چو چشم از غیر بربندی همه دیدار او بینی

۶. چو استاد ازل برزد رقم بر صفحهٔ جانم

۷. وقت شد کاید جمالش از نقاب من برون

۸. سر زلف عنبریں را به کرشمه تاب دادی

۹. من ازاں دیده که دیدار نه بیند چه کنم

۱۰. چو آیم به سر کویت که خواهم روی تو بینم

۱۱. عاقلان در کار خویش غافلان در کار دوست

۱۲. ای آفتاب طلعتت از مطلع جان تافته

۱۳. بنفشه می دمد ای گلعذار بر رخ تو

(از ورق ۱۵۵ الف تا ۱۷۲ الف) (کل ۴۵ غزلیں)

۱۴. دل کشتی است بر سر دریای نیم شب

۱۵. دل قست جام جہاں نما و سرشک دیده جلای دل

۱۶. بیا ساقی دمستاں را به میخانه صلا در ده

۱۷. امروز من در عشق او بر نار ہجراں سوختم

۱۸. بہر چشمی که می بیند در آئینه نگار من

۱۹. گرچه هر بد که تواں بر تن خود کردستم

۲۰. چنیں که عاشق اویم ز مرگ نندیشم

۲۱. ای گلستان دلم صد گل بباره از عشق تو

۲۲. تولی که از تتق آب و گل جمال نمودی

۲۳. تا ز خود بیگانه گشتم آشنائی یافتم

۲۴. چو نور مطلع عرفاں ظہور خواہد کرد

۲۵. خبری می رسد از عالم غیبی بشنو

۲۶۔ کہنہ دلقی است وجودِ تو بیند از در برد

۲۷۔ حکایت غم ہجراں تو زمن بشنو

۲۸۔ بہشت دیدن آں یار مہوش است مرا

۲۹۔ سخن از عشق می گفتم نوید وصل در دادی

۳۰۔ آہ سوزندہ کہ از جان غم آلودہ گذشت

۳۱۔ فرزدگانی کہ مرا یار سوی خویش کشید

۳۲۔ خبری فاش شد از سر نہانی بجہاں

۳۳۔ خبری می رسدم ہر نفس از غیب بگوش

۳۴۔ غافل منشیں و قدم اندر رہ حق نہ

۳۵۔ یارای آں چو نیست کہ در یار بنگرم

۳۶۔ صنم بہ بزم بقا کز می بقای تو مستم

۳۷۔ نیست آں اشک کہ در چشم ترم می گردد

۳۸۔ ہر کس[له] کہ بدل ز آتش عشقش علمی نیست

۳۹۔ بوای نظارگی کاندر جمال یار می بینی

۴۰۔ اگر بوادی ایمن براں بروں راہی

۴۱۔ محبوب خودای عاشق از غیر چرا جوئی

۴۲۔ ازاں زماں کہ نقش تو گرفت دلم

۴۳۔ نیست ایں اشک کہ بر چہرہ دوید ست زرد

۴۴۔ دل چہ یکی پیش نیست یار یکی بس بود

له ۳۸ تا ۴۱، ۴ غزلیں علی گڑھ قلمی جزو میں نہیں۔

۴۵۔ ہر دلی واقف اسرار تو نیست

۴۶۔ ساقی می ناب برگرفتہ

۴۷۔ ایں چہ بادہ است کاندر جام مستاں ریختی

۴۸۔ قدم چو بر رہِ گفت و شنود خواہم زد

۴۹۔ عاشقان جمال حق مستند

۵۰۔ من کہ تا آمدہ زیں دائرہ بیروں رفتم

۵۱۔ عاشقاں در کشاکش افتادند

۵۲۔ من رفیق آب خضرم ز آب حیواں بیخبر

۵۳۔ اے کہ دلم شکستۂ قیمت دل چہ می دہی

۵۴۔ صبا رسید و بلبل ز گل پیام آورد

۵۵۔ آمد خبری بگوشش جانم

۵۶۔ نیست نزدیک عقل اگر دانی

۵۷۔ بنگر بہ اشک سرخ و رخ زرد عاشق

۵۸۔ من ز بالائیم بہ بالا می روم

۵۹۔ [له]طلبگار تو ایم و تو گریزانی زمن (۱۶ اب) (ایک غزل)

۶۰۔ چشم سازای دل کہ شد محبوب خرسنگ بدن (۳۱، ب) (ایک غزل)

عبدالسلام کلکشن کے نسخے میں غزلوں کی تعداد ۱۷۹، دوسرے قلمی نسخے میں ۱۷۴ غزلیں اور مطبوعہ میں صرف ۱۲۲، عبدالسلام کلکشن میں مطبوعہ نسخے سے ساٹھ غزلیں

له یہ غزل بھی قلمی نسخے میں نہیں ہے۔

جن کی تفصیل اوپر درج ہے، زائد ہیں، اس حساب سے کم از کم تین غزلیں مطبوعہ دیوان میں ایسی ہیں جو قلمی نسخے میں نہیں، باوجود اس کے کہ میرے مطالعے کے تین نسخوں میں (ایک مطبوعہ اور دو قلمی) سب سے زیادہ غزلیات کا حامل عبدالسلام کلکشن والا ہی نسخہ ہے، لیکن اس کو کامل نہیں سمجھنا چاہیے، اس لیے کہ اس میں تین مطبوعہ نسخے کی زائد غزلیں، تین چار غزلیں جو حدائق الحقائق میں ہیں اور دیوان کے نسخوں میں نہیں، ایک غزل حبیب گنج کی "غزلیات معین الدین" میں نہیں ملتیں، آخر دو ماخذوں کی غزلوں کے مطلعے یہ ہیں :

گر گشائی دیدۂ دل حسن او بینی ہمہ (ص ۳۷۸)

اندلم صورت آں خوب ختن می نرود (ص ۴۸۲)

اگر از آئینۂ دل غلاف برخیزد (۵۴۵)

نسخۂ غزلیات معین الدین میں حسب ذیل غزل زیادہ ہے۔

حجاب از پیش خود بردار و بنما روی زیبا را (ورق ۱)

غرض غزلیات کے اعتبار سے نہ صرف مطبوعہ نسخہ ناقص ہے، بلکہ کوئی قلمی نسخہ بھی کامل نظر نہیں آتا، مثنویات، رباعیات اور دوسرے اصناف سخن کا کیا ذکر، دراصل معین ہروی کے دیوان کے ایک کامل انتقادی متن کی اشد ضرورت ہے، اور اس متن کی ترتیب اس طرح شروع ہو کہ دیوان کے قلمی نسخے جمع کیے جائیں، ان کے باہمی مقابلے سے غزلیات کا تعین کیا جائے، پھر معین ہروی کی نثری تصانیف کو اکٹھا کیا جائے اور ان میں سے خود ہروی کے اشعار جو ان تصانیف میں جا بجا ہوئے ہیں ان کو جمع کیا جائے ان میں کچھ اشعار تو مطبوعہ نسخے میں اور ان سے زیادہ قلمی نسخوں میں موجود ہیں، وہ سب جمع ہوں ان تصانیف میں خاصی تعداد میں مثنوی کے اشعار ہیں، وہ بھی جمع کر لیے جائیں معین ہروی نے

رباعیاں بھی لکھی ہیں، اور ان کی تصانیف میں ان کی بعض رباعیاں درج ہیں، مگر مصنف کے نام غائب ہیں، تحقیق کر کے ان میں سے معین ہروی کی رباعیوں کا تعین کر لیں، پھر سب دیوان میں شامل کریں، اس طرح یہ مجوزہ دیوان بڑی حد تک قابل اعتبار ہوگا

آخر میں اخلاق جہانگیری میں شامل معین الدین ہروی کی ایک غزل کے ذکر پر یہ گذارش ختم کی جارہی ہے۔

جہانگیر کے دور میں (۱۶۰۵-۱۶۲۷ء) نورالدین خاقانی نام کے ایک بزرگ گذرے ہیں، جنھوں نے اخلاق جہانگیری نام کی ایک ضخیم تصنیف یادگار چھوڑی ہے، اس کے دو نسخے معلوم ہیں، ایک انڈیا آفس (فہرست ایتھے 2207) کے کتابخانے میں دوسرا ٹونک میں صاحبزادہ محمد مصطفیٰ خان جوہر کے پاس، اس آخرالذکر نسخے کا تعارف رسالۂ معارف اعظم گڈھ ۱۹۶۴ء میں ہوا، انڈیا آفس کے نسخے کا عکس پروفیسر محمد اسلم، صدر شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے پاس ہے، اس کی روشنی میں پروفیسر صاحب نے ایک یادداشت مجلۂ علوم اسلامیہ علی گڑھ جلد ۱۳، نمبر ۱، ۲ صفحہ ۱۳-۱۴، ۱۷ درج کی ہے، راقم نے اسی سے استفادہ کیا ہے،

نورالدین خاقانی صاحب اخلاق جہانگیری ملا معین الدین الواعظ کے پوتے تھے، انھوں نے اپنی اس تصنیف میں جا بجا اپنے دادا کے اشعار درج کیے ہیں، جن کو وہ "لجدہٖ" کے اضافے سے ذکر کرتے ہیں، اخلاق جہانگیری میں اپنے دادا کے جو اشعار انھوں نے نقل کیے ہیں، وہ دیوان خواجہ معین الدین اجمیریؒ میں موجود ہیں۔

حسب ذیل غزل اگرچہ مطبوعہ دیوان میں نہیں، لیکن غزلیات معین الدین چشتیؒ

---

[1] غزلیات کا انتخاب ہے، نمبر ۴۴/۱۹۴، ورق ۹۶، سطر ۱۹، سائز "۵ × "۸ اس میں کل ۳۲ غزلیں ہیں

(بقیہ ص ۳۴ پر)

کتابخانۂ علی گڑھ حبیب گنج ۴۷/۱۹۴ میں موجود ہے :

حجاب از پیش خود بردار بنما روی زیبا را — دزاں رو مست گرداں عاقل سرت شیدا را

ز روئیت شمۂ گویا قرین ابن مریم شد — وگرنہ قوت احیار کجا بودی مسیحا را

چہ جای پاک از کوئش سلامت می تواں آمد — مگر مستش چناں گرداں کہ نشناسد سر پا را

تو چشم سر خود بکشا کہ تا دیدار او بینی — کہ چشم سر نمی بیند بغیر طور موسیٰ را

معین چشم حقیقت بین نظر بر ہر چہ اندازد — بذات حق بجا بیند وجود جملہ اشیا را

خلاصۂ گفتگو یہ ہے کہ جو دیوان حضرت خواجہ معین الدین چشتی کے نام سے مدون ہوا اس کے بیشتر اشعار بقول خود معین ہروی کے، اس کے ہیں، ان میں سے بعض کے بارے میں ہروی کے پوتے نورالدین خاقانی کی شہادت ہے کہ وہ اس کے دادا کے ہیں، تو پھر اس دیوان کی نسبت حضرت خواجہ کی طرف بے بنیاد ہے، سارا دیوان معین ہروی کا ہے، بلکہ اس کے کافی اشعار مطبوعہ دیوان میں شامل ہونے سے رہ گئے ہیں، غرض دیوان مذکور کو معین ہروی کی ملکیت سمجھنا چاہیے، خواجہ کی طرف اس کے انتساب کرنے کا کوئی قرینہ نہیں۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جن میں حسب ذیل چھ غزلیں مطبوعہ دیوان سے خارج ہیں :

(۱) حجاب از روی خود بردار بنما روی زیبا را الخ (۵ بیت)

(۲) ہر نظر محرم دیدار تو نیست — ہر دلی واقف اسرار تو نیست (۶ بیت)

آہ سوزندہ کہ بر جان غم آلود گذشت — آتشی بود کہ از فلکش دود گذشت (۵ ")

صبا رسید بہ بلبل ز گل پیام آورد — نوید تہنیت از بہر خاص و عام آورد (۱۲ ")

آمد خبری بگوش جانم الخ (۹ بیت)

ایں چہ بادہ است کاندر جام مستاں ریختی — بادۂ عشق است کاندر ساغر جاں ریختی (۷ بیت)

بیا ساقی کہ مستاں را شراب ناب درداری — چو گشتم مست ولایعقل نقاب از روئے بگشادی (۶ ")

اسامہ بن منقذ کے حالات کا ایک اہم ماخذ

علامہ مقریزی کی کتاب المقفیٰ الکبیر

از پروفیسر مختار الدین احمد علی گڑھ

"گذشتہ شمارہ میں فاضل محترم پروفیسر مختار الدین احمد صاحب کا جو محققانہ اور پر از معلومات مقالہ اسامہ بن منقذ پر شایع ہوا تھا، یہ مقالہ اسی کا تتمہ اور فاضل موصوف کی وسعتِ علم و نظر کا ثبوت ہے" (معارف)

یہاں تک لکھ چکا تھا کہ اسامہ بن منقذ کے متعلق ایک ایسے ماخذ تک میری رسائی ہوئی جس سے اس مصنف پر کام کرنے والے محققین، وہ یورپ اور امریکہ کے ہوں، یا شرق اوسط کے کوئی واقف نہیں۔ یہ تقی الدین احمد بن علی المقریزی (متوفی ۸۴۵ھ) کی ضخیم تصنیف کتاب المقفیٰ الکبیر کی ایک نایاب جلد ہے جو ترکیہ میں محفوظ ہے اور جس میں اسامہ کے مفصل حالات و اشعار درج ہیں۔

المقریزی، نویں صدی ہجری کے اہم مورخین میں ہیں، وہ ابن خلدون کے شاگرد ہیں اور ابوالمحاسن یوسف بن تغری بردی مصنف النجوم الزاہرۃ اور السخاوی صاحب الضوء اللامع جیسے مصنفین ان کے سلسلۂ تلامذہ میں شامل ہیں۔ تصانیف کی تعداد دو سو[200] کے قریب بتائی جاتی ہے، ان میں پچیس[25] تیس[30] شایع ہو چکی ہیں، بقیہ غیر مطبوع ہیں یا مفقود۔

المقریزی کی غیر مطبوعہ تصانیف میں کتاب المقفیٰ الکبیر اسلامی مصر کی تاریخ و تذکرے کی اہم ترین کتابوں میں شمار کی جا سکتی ہے، اس کے لکھے جانے کا انداز وہی ہے جو ابن عساکر کی تاریخ دمشق کا ہے جو اسّی جلدوں میں مرتب ہوئی تھی۔ پانچ سات جلدوں میں اس کا اختصار بحذف اسانید بدران نے دمشق سے شایع کرنا شروع کیا تھا لیکن وہ اسے مکمل نہ کر سکے۔ کتاب کے مکمل متن کا علمی اڈیشن تصحیحات و تعلیقات کے ساتھ ڈاکٹر صلاح الدین المنجد اور دوسرے سوری علما نے المجمع العلمی العربی (حال مجمع اللغۃ العربیۃ) دمشق سے شایع کرنا شروع کیا ہے۔ اس کی پہلی جلد ڈاکٹر المنجد نے سنہ ۱۹۵۱ء میں شایع کی، دوسری جلد بعد کو شایع ہوئی پھر دوسرے علما اس کام میں لگے اور ترتیب و اشاعت کا کام جاری ہے لیکن ابھی تک ربع کتاب بھی شایع نہیں ہو سکی ہے۔

المقریزی بھی اسی وسیع پیمانے پر جس طرح بغداد اور دمشق کی تاریخیں خطیب بغدادی اور ابن عساکر نے لکھی ہیں، مصر کی ایک ضخیم تاریخ اسّی جلدوں میں لکھنی چاہتے تھے لیکن وہ صرف سولہ جلدیں لکھ سکے تھے کہ وفات پا گئے۔ کتاب کی بعض جلدیں میرے خیال میں صرف مسودے کی شکل اختیار کر سکیں، اگر ان کے بییضات تیار ہوئے تو وہ مصنف کی وفات کے بعد اس طرح منتشر ہو گئے کہ ان کی نقلیں تیار نہ ہو سکیں اور عالم اسلام میں مروج نہ ہو سکیں۔ السخاوی اور السیوطی ایسے مصنفین ہیں جن کی کتابوں میں کتاب المقفیٰ کے حوالے مجھے ملے ہیں، یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان اصحاب کے پاس اس تاریخ کا مکمل نسخہ تھا یا اس کے صرف چند مجلدات۔ السخاوی بہر حال سولہ جلدوں کا ذکر کرتے ہیں اور الضوء اللامع میں کتاب کی کچھ جلدوں سے ضرور انھوں نے استفادہ کیا ہے۔ لطف کی بات یہ ہے کہ السیوطی نے کسی تاریخ کی کتاب میں نہیں نحویوں کے تذکرہ طبقات النحاۃ میں

اس سے مدد لی ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان کے پاس المقفیٰ کی صرف ابتدائی جلدیں تھیں۔ افسوس یہ ہے کہ اب ان سولہ جلدوں میں نصف بھی موجود نہیں، ظاہراً ضایع ہو گئیں، جو جلدیں ملتی ہیں وہ بھی کسی ایک کتاب خانے میں محفوظ ہونے کے بجائے دیار و امصار میں منتشر ہو گئی ہیں۔

سب سے پہلے کتاب المقفیٰ کی ایک جلد کے وجود کی اطلاع مجھے سنہ ۱۹۵۳ء کے اواخر میں آکسفرڈ میں ملی، باڈلین لائبریری میں لبنان کے یسوعی علما کے علمی رسالے المشرق (بیروت) کے مکمل شمارے موجود ہیں۔ الاستاذ حبیب الزیات نے ایک شمارے میں مشہور نحوی ابو العباس محمد بن یزید الثمالی الازدی المبرد (متوفی ۲۸۵ھ) کا ترجمہ کتاب المقفیٰ سے لے کر شایع کیا تھا۔ یہ کتاب المقفیٰ سے میرا پہلا تعارف تھا۔

سنہ ۱۹۵۴ء اور سنہ ۱۹۵۵ء کے کچھ مہینے میں نے اپنے آکسفرڈ کے مقالہ تحقیق کی تیاری اور اہم مخطوطات کی تلاش میں ہالینڈ، جرمنی اور فرانس میں گزارے، ایک دن لائیڈن یونیورسٹی لائبریری میں المقفیٰ کی تین مختصر جلدوں کے مسودات دیکھنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ یہ دیکھ کر مزید مسرت ہوئی کہ یہ تینوں جلدیں خود المقریزی کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ہیں میں نے المقریزی کی متعدد تحریریں اور بعض مخطوطات پر ان کی تملیکات اور دستخط دیکھے تھے، فوراً اندازہ ہو گیا کہ یہ المقریزی کے ہاتھ کا لکھا ہوا مسودہ ہے، دوسرے قرائن بھی اس کے مؤید نکلے۔ کتاب المقفیٰ میں تراجم حروف تہجی کے اعتبار سے مرتب ہیں، لیکن صلاح الدین الصفدی (متوفی سنہ ۷۶۴ھ) کی الوافی بالوفیات کی طرح ادب و احترام کے پیش نظر ان اصحاب کا پہلے ذکر کیا گیا ہے جن کا نام نامی محمد یا احمد ہے، لائیڈن کے مخطوطے میں انھیں کا ذکر ہے اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ یہ ابتدائی جلدیں ہیں۔

کچھ دنوں کے بعد فرانس جانے کا اتفاق ہوا، وہاں پیرس کے کتب خانہ ملّی میں کام کرنے کا اتفاق ہوا، وہاں المقفیٰ کی ایک جلد ملی، یہ بھی مسودۂ مصنف تھا، اس انکشاف پر بہت مسرت ہوئی ساتھ ہی ساتھ حیرت بھی ہوئی کہ مصر سے نکل کر ان مجلدات نے معلوم نہیں کہاں کہاں کا سفر کیا ہوگا، اب تین جلدیں اس کتاب کی ہالینڈ کے ملک میں پہنچیں اور ایک جلد فرانس جا پہنچی۔

یورپ سے واپسی پر اپریل ۱۹۵۶ء میں چند دنوں کے لیے قاہرہ اترا، دار الکتب المصریہ گیا، وہاں بھی المقفیٰ کی ایک دو جلدیں دیکھیں۔ خیال ہے کہ حبیب زیات نے اسی نسخے کا مطالعہ کیا ہوگا، اس کی ترتیب و اشاعت کی طرف افسوس ہے کہ مصری عالم یا ادارے نے بھی توجہ نہیں کی۔ شاید ایک غیر مکمل کتاب کی ایک دو جلدوں کی اشاعت انھیں مفید نظر نہ آئی ہو۔

۱۹۶۸ء میں جب میں شعبۂ عربی کی پروفیسر شپ کے عہدے پر فائز ہوا تو ہالینڈ سے اس کتاب کی تینوں جلدوں اور فرانس کی ایک جلد کا عکس منگوا کر چاروں جلدوں کو پھر ایک ساتھ کر دیا، پھر اپنی نگرانی میں اپنے تین شاگردوں سے انھیں مرتب کرایا، جن پر ان حضرات کو علی گڑھ سے ڈاکٹریٹ تفویض ہوئی۔ نسخہ لائیڈن کی پہلی جلد جسے میرے دوست ایک ایرانی اسکالر پروفیسر آقائے سید محمود اسد اللہی جامعۂ مشہد (ایران) نے مرتب کیا ہے شایع ہونے والی ہے۔

۱۹۸۷ء میں عمان/اردن کی کانفرنس کے بعد عمرے کے لیے مکہ مکرمہ پہونچا تو عزیز گرامی محمد عزیر شمس ملے جو اس زمانے میں جامعہ ام القریٰ سے ام اے کر رہے تھے۔ ان کے ساتھ جامعہ کے کتب خانے گیا اور متعدد مخطوطات و مصورات دیکھے۔ المقفیٰ کی

کچھ جلدوں کی مائکروفلمیں بھی دیکھیں، لیکن ان میں کوئی جلد ایسی نہ تھی جن کا علم مجھے پہلے سے نہ ہو اور میری نظر سے نہ گزر چکی ہوں۔

اس سال ۱۴۱۱ھ/۱۹۸۹ء میں حج و زیارت حرمین شریفین زاد اللہ شرفہما کی سعادت حاصل ہوئی۔ ڈیڑھ ماہ اس دیار پاک میں گذارے، واپسی سے ایک دو دن پہلے محمد عزیر صاحب ملنے آئے جو اب جامعہ ام القریٰ میں ڈاکٹریٹ کر رہے ہیں، انھوں نے ذکر کیا کہ المقفیٰ کی ایک جلد کا نسخہ مکتبۂ سلیمیہ (ترکیہ) میں محفوظ ہے اس جلد میں ابراہیم تا خیثمہ کے تراجم ہیں اور اس کی مائکروفلم جامعہ کی لائبریری میں محفوظ ہے، میں نے اس بنا پر کہ اس جلد میں اسامہ بن منقذ کا ترجمہ ہے عکس کی فراہمی کی ان سے فرمائش کی۔ اس کا عکس آج ۵ دسمبر ۱۹۹۰ء کو موصول ہوا، اسامہ کے حالات و اشعار دیکھ کر بہت مسرور ہوا کسی کتاب میں اس قدر تفصیل اور شرح و بسط کے ساتھ اسامہ کے حالات نہیں ملتے جیسے المقفیٰ میں درج ہیں، اس میں ان کا پورا شجرۂ نسب تحریر کیا گیا ہے، انکی زندگی کے بارے میں بعض اہم معلومات درج ہیں اور سب سے اہم بات یہ کہ ان کی تصانیف کی مکمل فہرست درج ہے جو المقریزی کے علم میں آسکی ہیں۔ ان میں ایسی کتابوں کے نام بھی ملتے ہیں جن کے متعلق آج تک کسی کو کچھ معلوم نہ تھا، اس میں اسامہ کی ۲۰ تصانیف کا ذکر ہے، جن کا ذکر دوسرے مصادر میں نہیں صرف کتاب المقفیٰ میں ملتا ہے ان کی تعداد پچیس ۲۵ ہے اور وہ حسب ذیل ہیں۔ اسامہ بن منقذ کی ان تصانیف کی اطلاع پہلی مرتبہ معارف میں شایع کی جا رہی ہے:

(۱) کتاب الحنین إلی الاوطان (۲) کتاب رسائل السائل یتضمن الادعیۃ و وقاتها و ما ورد فیها (۳) کتاب البشارات (۴) کتاب زجر عمرو بن بحر الجاحظ

فیہ النہی عن الزنا واللواط والفواحش (۵) کتاب فضائل الخلفاء الراشدین (۶) کتاب المحاسن (۷) کتاب نزہۃ الناظر فی املاء الخاطر (۸) کتاب ردع الظالم ورد المظالم (۹) کتاب مکارم الاخلاق ، یہ اطلاع بھی ملتی ہے کہ یہ کتاب بیس۲۰ جلدوں میں اسامہ نے قیام مصر کے زمانہ میں لکھی تھی اور اس پر ان کی عمر عزیز کے دس۱۰ سال صرف ہوئے تھے ۔ (۱۰) کتاب المنتخب من اشعار العرب (۱۱) کتاب المختار من محدث الاشعار (۱۲) کتاب المماثلۃ فی الشعر (۱۳) کتاب معونۃ المساعد علی حصر الشواهد فی الشعر (۱۴) کتاب الاقسام فی الشعر (۱۵) کتاب امان الخائفین فی الزهد (۱۶) کتاب فیہ شعر جماعۃ سألہ ابن الزبیر عنهم (۱۷) کتاب المکارم والکرم ورعایۃ الرحم (۱۸) کتاب الفرق بین المحبۃ والهوی (۱۹) کتاب ... ابی العلاءؒ (۲۰) کتاب ضربۃ الولاء (۲۱) کتاب اختیار شعر ابی تمام (۲۲) مختار شعر ابی نواس (۲۳) کتاب لباب الابواب ۔ (اس کا امکان ہے کہ یہ لباب الآداب کی تصحیف ہو اور یہ بھی بعید از قیاس نہیں کہ اس نام کی کوئی علٰحدہ کتاب ہو) (۲۴) کتاب استدراک المرتاب : یہ الشیب والشباب کا ملحق ہے جس میں اس موضوع پر اضافات کیے گئے ہیں ۔ (۲۵) کتاب الدیر والحصون ۔ یہ اسامہ کی ان کتابوں کی فہرست ہے جن کا ذکر پہلی بار المقریزی کے یہاں ملتا ہے اور جیسا کہ اوپر لکھا گیا کہ دوسرے مصادر ان کے ذکر سے خالی ہیں اس لیے المقریزی کے اندراجات کی اہمیت بڑھ جاتی ہے ۔

اسامہ بن منقذ کی جن تصانیف کا ذکر ابتدا میں گزرا ان میں سے کچھ کے بارے میں کتاب المقفی میں بعض اضافی معلومات ملتے ہیں جن کا ذکر فائدے سے خالی نہیں ۔

کتاب التاریخ البدری : یہ کتاب حروف معجم پر پانچ۵ ضخیم مجلدات پر مشتمل ہے ، جس میں اصحاب بدر (غالباً مومنین و مشرکین دونوں) کے حالات لکھے ہیں ، ان کی تعداد بتائی ہے ۔ اس میں مغازی النبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک باب ہے جس میں جمیع احوال من اولہ الی آخرہ درج ہیں ۔

کتاب الشیب والشباب : اس میں خضاب پر بھی ایک فصل ہے اور اس کے بارے میں جو کچھ (نظم و نثر میں ؟) وارد ہوا ہے سات ابواب پر مشتمل ہے ۔ ہر باب میں متعدد فصلیں ہیں ۔ اسی کا ملحق استدراک المرتاب کے نام سے اسامہ نے مرتب کیا تھا ۔

کتاب اخبار النساء : اس کی ابتدا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ اور حضرت مریم بنت عمران کے ذکر سے کی گئی ہے ۔ اس میں "امہات العرب والاخوات والزوجات والبنات المنجبات" کے حالات سپرد قلم کیے گئے ہیں اور ان میں جو شاعرات تھیں ان کے اخبار و اشعار بھی درج کیے گئے تھے ، ان کے بارے میں جو کچھ کہا گیا ہے (از قسم تنقید و تبصرہ) وہ سب بھی اس کتاب میں مذکور ہیں ۔

کتاب ازہار الانہار : اس میں جنت کا حال ' اور لبن کے منافع و مضرات سے بھی بحث کی گئی ہے ۔

کتاب تاریخ ذکر الحوادث : ابتدائے ہجرت سے مصنف نے اپنے عہد تک کے حوادث کا اس میں ذکر کیا ہے ۔

ان اندراجات سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اسامہ بن منقذ کی متعدد تصانیف المقریزی کی نظر سے گزری تھیں ۔ اس نامور مورخ کے پاس بہت قیمتی ذخیرہ کتابوں کا تھا ، تعجب نہیں کہ اسامہ کی بھی بعض تصانیف خود اس کے کتب خانے میں موجود ہوں ۔

یورپ، شرق اوسط اور ایشیا میں ایسی متعدد کتابیں میری نظر سے گزری ہیں جن میں المقریزی کی تحریرات، تملیکات اور دستخط ثبت ہیں اور خدا کا شکر ہے کہ اب بھی محفوظ ہیں۔ ان میں الفہرست لابن الندیم اور مقدمہ ابن خلدون کے نسخے یاد آتے ہیں۔

کتاب الاعتبار: الاستاذ قاسم السامرائی نے بھی ایک نسخے کی بنا پر مرتب کر کے شایع کی ہے، معلوم نہیں، شیخ ابوغدہ کے پیش نظر صرف ہٹی کا اڈیشن ہے یا السامرائی کا اڈیشن بھی رہا ہے؛ فرانسیسی مستشرق درانبورغ کا اڈیشن تو شاید ان کی نظر سے نہیں گزرا ہو۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ وہ یہ تینوں اڈیشن سامنے رکھتے اور اسکوریال کا اصل مخطوطہ بھی۔

حکیم ابوالفتح گیلانی

از جناب حکیم الطاف احمد اعظمی جامعہ ہمدرد دہلی

حکیم کا نام مسیح الدین اور ابوالفتح کنیت تھی، حکیم کے والد کا نام ملا عبدالرزاق تھا۔ یہ گیلان کے علاقہ لاہیجان کے رہنے والے تھے، حکمت اور علم الٰہیات دونوں میں ید طولیٰ رکھتے تھے[1] والی گیلان خان احمد کے دربار میں صدر الصدور کے منصب پر فائز تھے۔ ۹۷۴ھ مطابق ۶۷-۱۵۶۶ء میں شاہ طہماسپ (۱۵۷۶-۱۵۲۴ء) نے گیلان کو فتح کیا تو اس کے فرماں روا خان احمد کے ساتھ ملا عبدالرزاق کو بھی قید کر لیا اور قید ہی میں ان کا انتقال ہوگیا[2]۔ ملا عبدالرزاق کے چار لڑکے تھے۔

۱- حکیم مسیح الدین ابوالفتح ۲- حکیم لطف اللہ ۳- حکیم نجیب الدین ہمایوں (حکیم ہمام) ۴- نورالدین قراری[3]۔

حکیم ابوالفتح سب بھائیوں میں بڑا تھا۔ باپ کے قید ہو جانے کے بعد ۹۸۲ ہجری تک وہ اس کوشش میں رہا کہ کسی طرح صفوی دربار میں باریابی حاصل ہو جائے۔ لیکن

---

[1] مآثر الامراء ج ۱ ص ۵۵۵ [2] ملا عبدالرزاق کو پہلے قزوین کی جیل میں رکھا گیا بعد میں خرسک کے قلعہ میں منتقل کر دیا گیا تھا جہاں انہیں ایذائیں دیکر صرف اس لیے ختم کر دیا گیا کہ وہ اپنے آقا (خان احمد) کی وفاداری دست بردار ہونے کے لیے تیار نہ تھے۔

ناکام رہا۔ آخر کار ۹۸۳ھ (۱۵۷۶ء) میں وہ اپنے دو بھائیوں حکیم نجیب الدین ہمایوں (ہمام) اور حکیم نورالدین قراری کے ساتھ گیلان چھوڑ کر پہلے اردبیل آیا اور وہاں سے ہندوستان چلا آیا۔[1] اس وقت حکیم کی عمر لگ بھگ ۳۰ سال تھی۔

اعزاز و منصب

بیسویں سال جلوس اکبری ۹۸۳ھ (۱۵۷۵ء) میں حکیم ابوالفتح نے اکبر کے دربار میں رسائی حاصل کی۔[2] وہ نہایت دور اندیش، زمانہ شناس اور حد درجہ ذہین و فطین شخص تھا اس لیے بہت جلد ترقی کر کے اعلیٰ مدارج تک پہنچ گیا۔ ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں:[3]

"بادشاہ کی خدمت میں اسے مرتبہ تقرب حاصل تھا اور اس کے مزاج میں اس درجہ دخیل تھا کہ تمام امرائے دولت اس سے حسد کرتے تھے۔"

مولف مآثر رحیمی بادشاہ کے ساتھ اس کے قرب و اختصاص کے متعلق لکھتا ہے:[4]

"بادشاہ کے مزاج میں اسے جو دخل و قرب حاصل تھا وہ جعفر برمکی کو بھی ہارون رشید کے مزاج میں حاصل نہ تھا۔"

یہی وجہ ہے کہ ملازمت کے چوتھے سال یعنی ۹۸۷ھ مطابق ۱۵۷۹ء کے وسط میں بادشاہ نے اسے صوبہ بنگال کی صدارت اور امینی کے ممتاز عہدے پر مامور کیا۔ ابوالفضل لکھتا ہے:[5]

"در ۹۸۷ ہجری حکیم ابوالفتح را بصدارت و امینی اختصاص بخشیدند۔"

---

[1] تاریخ علماء و شعرائے گیلان ص ۳۷ و مآثر الامراء ج ۳ ص ۲۴۴ [2] اکبر نامہ ج ۳ ص ۱۴۶ مآثر الامراء میں لکھا ہے کہ حکیم ۹۷۴ ہجری مطابق ۱۵۶۷ عیسوی میں ہندوستان آیا۔ یہ بیان صحیح نہیں ہے [3] منتخب التواریخ ج ۳ ص ۱۶۷ [4] مآثر رحیمی ج ۳ ص ۷۸۶ [5] اکبر نامہ ج ۳ ص ۲۶۶۔

مولف مآثر الامراء لکھتا ہے:[1]

"حکیم ابوالفتح ترقی نمودہ سال بیست و چہارم (جلوس ۹۸۷ ہجری) بصدارت و امینی صوبۂ بنگال تعین گردید۔"

حکیم ابوالفتح بنگال میں تقریباً ایک سال رہا۔ ۹۸۸ ہجری میں بابا خاں قاقشال اور بنگال کے دوسرے جاگیرداروں نے ناظم بنگال مظفر خاں کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ اس لڑائی میں حکیم ابوالفتح، رائے پترداس، خواجہ شمس الدین اور بہت سے دوسرے سردار قید ہو گئے۔[2] لیکن ابوالفتح کی دانائی اور خوش تدبیری سے یہ تینوں سردار قلعہ سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ جب حکیم دربار میں پہنچا تو اکبر اس کی ہشیاری اور زیرکی سے بے حد خوش ہوا اور اس کی نظر میں حکیم کی قدر و منزلت پہلے سے بھی زیادہ ہو گئی، مولف مآثر الامراء لکھتا ہے:[3]

"چوں باستاں بوس فائز شد بہ قرب و اعتبارش افزودہ، بہ اقران و امثال خود رجحان گرفت۔"

۹۸۸ ہجری یعنی ملازمت کے پانچویں سال حکیم کو پایۂ تخت کی صدارت تفویض ہوئی۔ ملا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں:[4]

"درمیان دو آب شیخ فیضی را صدر ساختہ و آں طرف گنگ حکیم ہمام، و صدر

---

[1] مآثر الامراء ج ۱ ص ۵۵۵ [2] بنگال کی اس لڑائی میں والی بنگال مظفر خاں کو بھی باغیوں نے قید کر لیا اور پھر جان سے مار ڈالا (منتخب التواریخ ج ۲ ص ۲۸۲) [3] مآثر الامراء ج ۱ ص ۵۹-۵۵۸ (اسی ہنگامے میں حکیم ابوالفتح کا بھائی نورالدین قراری مارا گیا جو اس کے ساتھ ہی دو صدی منصب پر بنگال گیا تھا) [4] منتخب التواریخ ج ۲ ص ۲۹۶۔

پای تخت حکیم ابوالفتح را گردانیدند۔"

۹۸۹ ہجری میں حکیم کو پایۂ تخت میں امین اور دیوان مقرر کیا گیا۔[1] اور ۹۹۳ ہجری میں ہشت صدی کے منصب سے نوازا گیا، ابوالفضل لکھتا ہے:[2]

"در سال ۹۹۳ ہجری حکیم ابوالفتح ہشت صدی شد۔"

۹۹۴ ہجری میں حکیم کو افغان باغیوں کے خلاف مہم پر بھیجا گیا۔ جہاں زین خاں کوکلتاش پہلے سے افغان باغیوں کی سرکوبی میں مصروف تھا۔ اس فوجی مہم پر حکیم کے ساتھ راجہ بیربر (بیربل) بھی گیا تھا۔ یہ مہم ناکام رہی اور بیربر باغیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔ بیربر کی موت سے اکبر کو اس قدر صدمہ پہنچا کہ اس نے حکیم ابوالفتح اور زین خاں کی دربار میں حاضری بند کردی۔ ابوالفضل اور شاہ فتح اللہ شیرازی کی سفارش سے انھیں دوبارہ حاضری کی اجازت ملی۔

علم و فضل اور حذاقت حکیم ابوالفتح جملہ علوم و فنون پر نظر غائر رکھتا تھا۔ ملا عبدالقادر بدایونی نے بھی جو حکیم کے سخت مخالف بلکہ معاند تھے، اس کے علم و فضل کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:[3]

"تیزی فہم، جودت طبع، کمالات انسانی اور نظم و نثر میں اسے کامل امتیاز حاصل تھا۔"

مولف نزہۃ الخواطر لکھتے ہیں:[4]

"وہ علوم حکمیہ کا ایک بڑا عالم، نغز گو شاعر، ذکی و نکتہ رس اور نہایت

---

[1] رقعات ابوالفتح (خط بنام ہمام مورخہ ربیع الاول ۹۸۶ ہجری) [2] اکبر نامہ ج ۳ ص ۴۵۷ [3] منتخب التواریخ ج ۳ ص ۱۶۷، مولف طبقات اکبری نے لکھا ہے "بحدت فہم و جودت طبع و دیگر کمالات انسانی امتیاز داشت" (ج ۲ ص ۴۹۳) [4] نزہۃ الخواطر ج ۴ ص ۱۱۔

حاذق طبیب تھا۔"

حکیم ابوالفتح بلا شبہہ طبیب حاذق تھا۔ اس کی طبی تالیف فتاحی جو قانونچہ (چغمینی) کی شرح ہے اس کی علمی فضیلت اور طبی لیاقت کا ثبوت ہے۔ شہنشاہ اکبر کو جب مرض اسہال لاحق ہوا اور حکیم علی گیلانی جیسے فاضل طبیب کے علاج سے فائدہ نہ ہوا تو اس نے مایوسی کے عالم میں دانائے روزگار حکیم ابوالفتح کو یاد کیا، مولف اکبر نامہ لکھتا ہے:[1]

"آنگاہ یاد دانائی روزگار حکیم ابوالفتح دجالینوس زماں حکیم مصری فرمودہ بر فوت آں دو حکیم تاسف کردند۔"

حکیم کو طب کے علاوہ فلسفہ اور علم نجوم سے بھی گہری واقفیت تھی۔ اس کی تالیف قیاسہ جو اخلاق ناصری کی شرح ہے اس کے تبحر علم، وسعت مطالعہ اور ژرف نگاہی پر دال ہے۔ اس شرح میں حکیم نے مسائل حکمت کو نقلی دلائل سے بھی ثابت کیا ہے۔ فلسفہ سے اس کے غیر معمولی شغف کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے ملا احمد ٹھٹوی کو خلاصۃ الحیات (مشتمل بر مسائل فلسفہ) کے لکھنے کی طرف مائل کیا چنانچہ ملا نے یہ کتاب لکھ کر حکیم کے نام سے معنون کی۔

حکیم کو فلسفہ و طب کے علاوہ شعر و سخن سے بھی دلچسپی تھی جیسا کہ ملا عبدالقادر بدایونی نے بھی لکھا ہے۔ حکیم ارباب شعر و سخن کا نہ صرف قدرداں بلکہ ان کا مربی و رہنما بھی تھا۔ نواب صدر یار جنگ مولانا محمد حبیب الرحمن شروانی نے لکھا ہے:[2]

"مغلوں نے جو قوت اور وسعت نگاہ فنون لطیفہ کی تربیت و پرورش میں نمایاں

---

[1] اکبر نامہ ج ۳ ص ۴۸ [2] ملاحظہ ہو دیباچۂ کلیات عرفی۔ بحوالہ (Proceeding fifth Indian oriental conference, Lahore 1930, Vol. 11. P. 1328-29)

ازل کی بارگاہ سے پائی تھی اس میں اب تک فرد ہیں اسی تربیت کے اثر سے فارسی تغزل میں وہ لطف و رنگینی پیدا ہوئی کہ خود ایران اس کے پیدا کرنے سے قاصر رہا۔ جو اہل کمال ایران سے ہندوستان میں آکر فیض یاب ہوئے مثلاً عرفی و نظیری ان کے لطف کلام کو ان کے وہ ایرانی معاصر نہ پاسکے جو ایران ہی میں رہے۔ یہ تحقیق ہے کہ عرفی و نظیری ہندوستان آکر خان خاناں اور حکیم ابوالفتح کی صحبت میں عرفی و نظیری بنے"[۱]

حکیم کی وفات پر عرفی نے جو مرثیہ کہا اس میں اس حقیقت کا اعتراف ان لفظوں میں کرتا ہے:

کہ رہبرش بعدم شد کہ مرگ در مرگش　　سیاہ پوش ترا ز عمر جاوداں آمد

(کلیات ص۲۳)

دربار اکبری کے اکثر بلند پایہ شعراء مثلاً عرفی شیرازی خواجہ حسین ثنائی خراسانی، مرزا قلی میلی اور حیاتی گیلانی وغیرہ حکیم ہی کے دامن تربیت سے وابستہ تھے[۱]۔ یہ حکیم ہی کے فیض صحبت کا اثر تھا کہ ان شعراء نے واقعہ گوئی، معاملہ بندی، خیال بندی، مضمون آفرینی، صنعت ایہام، استعارات و تشبیہات، فلسفیانہ خیالات اور حسن ترکیب میں طرح طرح کی جدتیں پیدا کیں جو اس دور کی شاعری کی نمایاں خصوصیات تھیں۔

حکیم خود شاعر خوش گفتار تھا، یہ شعر اسی کا ہے:

چو نیم مدہ چہ راغیست آتشیں جانم　　کہ در ہوای تو در راہگذر باد صبا است[۲]

حکیم کے خطوط کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ موزونی طبع اور شعرا کی قدردانی کے باوجود شعرگوئی کو پسندیدگی کی نظر سے نہ دیکھتا تھا۔ وہ اسے نفس کی ایک بیماری سمجھتا تھا، ایک خط میں لکھتا ہے:[۳]

---

[۱] مآثر رحیمی ج ۳ ص۴۲۹ [۲] تاریخ علماء و شعرائے گیلان ص۲۸۸ [۳] رقعات ابوالفتح گیلانی ص۱۴۲ خط نمبر ۷۰ (حکیم نے یہ خط ہندوستان آنے کے بعد کسی ایرانی دوست کو لکھا تھا)

"و اشعار خواندن و گفتن از بیماری ہائے نفس است، قدری باید کرد و تہذیب اخلاق نمود۔"

اخلاق و عادات

حکیم نہایت خوش اخلاق، منکسر المزاج، احباب نواز اور غریب پرور تھا۔ مولف مآثر الامراء لکھتا ہے:[۱]

"حکیم ابوالفتح مخلوق کا کام بنانے میں خود کو باز نہیں رکھتا تھا۔ وہ جو کام بھی کرتا تھا عقل کے مطابق ہوتا تھا، وہ کریم الصفات، محسن زماں اور کمالات میں یگانۂ روزگار تھا۔"

مولف مآثر رحیمی لکھتا ہے:[۲]

"بادشاہ کی ملازمت میں اسے جو مرتبہ و استحقاق حاصل تھا اس کی بنیاد پر وہ خلق خدا کے مقاصد و مطالب کی تکمیل میں خود کو اس درجہ مصروف رکھتا تھا کہ اس سے زیادہ تصور نہیں کیا جا سکتا ہے۔ عراق و خراسان اور دنیا کے دوسرے ممالک سے تعلق رکھنے والے بہت سے لوگ حکیم کے وسیلہ اور تربیت سے حکومت کے اونچے مناصب تک پہنچے۔"

اکبری عہد کے مورخین میں صرف ملا عبدالقادر بدایونی نے حکیم کو الحاد اور اخلاق ذمیمہ سے متہم کیا ہے، لکھتے ہیں:[۳]

"بے دینی اور جملہ اخلاق ذمیمہ میں ضرب المثل تھا۔"

بعد کے مورخین نے ملا عبدالقادر بدایونی کے مذکورہ الزام کو کسی تحقیق کے بغیر نقل کر دیا ہے مثلاً مولف نزہتہ الخواطر لکھتے ہیں:[۴]

---

[۱] مآثر الامراء ج ۱ ص۵۵۷ [۲] مآثر رحیمی ج ۳ ص۴۲۸ [۳] منتخب التواریخ ج ۳ ص۱۶۷ [۴] نزہتہ الخواطر ج ۴ ص۱۱

" بدایونی نے اسے زندقہ سے متہم کیا ہے اور لکھا ہے کہ وہ الحاد و زندقہ اور اخلاق ذمیمہ میں ضرب المثل تھا۔ اکبر کو منکرات کی طرف اسی نے مائل کیا، ... وہ بندۂ درہم و دینار تھا، سلطان کو اباطیل کی طرف ترغیب دیتا تھا اور اسے گمراہ کرتا تھا"

ملا عبدالقادر بدایونی نے حکیم کے اخلاق ذمیمہ سے متعلق صرف ایک واقعہ لکھا ہے اور وہ یہ ہے[1]:

فقیر ایامیکہ حکیم نوآمدہ بوداز وی شنیدم کہ می گفت: خسرو ست و ہمیں دوازدہ است، انوری راپیوستہ بہ انوریک مداح و خاقانی را می گفت کہ اگر او دریں زمانہ می بود بسیار ترقی می یافت بایں طریق کہ ہرگاہ پیش من می آمد اورا سیلی می زدم تا کاہلی طبیعت را می گذاشت و چوں ازاینجا پیش شیخ ابوالفضل می رفت او سیلی می زدو شعر او اصلاح می داد۔

" یہ ان دنوں کی بات ہے جب حکیم ابھی نیا نیا آیا تھا، میں نے اس کو کہتے ہوئے سنا کہ: خسرو اور وہی بارہ شعر ہیں، انوری کو انور ایک مداح کہا کرتا تھا اور خاقانی کے بارے میں کہتا تھا کہ اگر وہ اس زمانہ میں ہوتا تو خوب ترقی کرتا اس طور پر کہ جب میرے پاس آتا تو میں ایک چپت رسید کرتا تاکہ طبیعت سے کاہلی اور سستی رفع ہو جاتی اور جب یہاں سے ابوالفضل کے پاس جاتا تو وہ چپت رسید کرتا اسی طرح اس کے شعر کی اصلاح دیتے"۔

اس سے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ حکیم خود کو ان شعراء سے برتر سمجھتا تھا۔ اسے شاعرانہ تعلی اور زعم ہمہ دانی تو کہا جا سکتا ہے لیکن اخلاق ذمیمہ کہنا مشکل ہے۔ علاوہ ازیں بدایونی کے مذکورہ بیان کی کوئی تائید دوسرے معاصر مصنفین و مورخین کی شہادتوں

[1] منتخب التواریخ ج ۳ ص ۱۶۷۔

سے نہیں ہوتی۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ حد درجہ متواضع، خاکسار اور نیک نہاد تھا۔ احباب کو غیر معمولی احترام و اکرام سے خط لکھتا تھا، ارباب بست و کشاد سے غربا اور مستحقین کی سفارش کرنے سے کبھی دریغ نہ کرتا تھا۔ رقعات میں خانخاناں وغیرہ کے نام حکیم کے جو خطوط ہیں وہ اس امر کی واضح شہادت دیتے ہیں[1]۔

حکیم کے عقائد ملا عبدالقادر بدایونی نے حکیم پر بے دینی کا جو الزام لگایا ہے وہ بھی خلاف حقیقت اور بے وزن ہے جس کی تردید کے لیے صرف درج ذیل واقعہ کافی ہے جو مآثر الامراء میں شہباز خاں سے متعلق مذکور ہے، شاہنواز خاں لکھتے ہیں[2]:

بے وضو (یعنی شہباز خاں) نمی بود و ہمیشہ تسبیح در دست ورد میخواند۔ چوں ما بین عصر و مغرب حرف دنیوی نمی گفت؛ روزے آخر وقت عرش آشیانی بکنار تالاب فتحپور کسب ہوا می کردند و بہت شہباز خاں گرفتہ مشغول حرف زدن بودند۔ از ہر ساعت نگاہے بآفتاب می کرد۔ حکیم ابوالفتح با حکیم علی می گفت: اگر امروز نماز عصر ایں مرد قضا نشود میدانیم کہ واقعی دیندار است۔ چوں وقت نماز تنگ شد ناچار عرض کرد

وہ یعنی شہباز خاں کبھی بے وضو نہیں رہتا تھا اور ہمیشہ ہاتھ میں تسبیح لیے ورد کرتا رہتا تھا، عصر و مغرب کے درمیان کسی قسم کی دنیوی گفتگو نہ کرتا تھا۔ ایک روز دن کے آخری اوقات میں عرش آشیانی فتحپور کے تالاب کے کنارے ہوا خوری کر رہے تھے اس حال میں کہ شہباز خاں کا ہاتھ ان کے ہاتھ میں تھا اور گفتگو کر رہے تھے۔ شہباز خاں کی نظر ہر آن سورج پر تھی حکیم ابوالفتح نے حکیم علی سے کہا: اگر آج اس شخص کی نماز عصر قضا نہ ہوئی تو ہم مان

[1] رقعات ابوالفتح گیلانی ص ۶۲، ۶۳ [2] مآثر الامراء ج ۲ ص ۵۹۹۔

بادشاہ فرمود قضا خواہی کرد مارا تنہا میگذاری؟ شہباز خاں بے اختیار دست خود را کشید و دوپٹہ انداختہ شروع بہ نماز نمود و پس ازاں مشغول ورد گشت، بادشاہ ہر لمحہ دستے بسرش می زد کہ برخیز[1] حکیم ابوالفتح گفت، انصاف نیست کہ در شغل ایں عزیز خلل شود[2] پیش رفتہ عرض کرد کہ ایں ہمہ لطف تنہا باایں مرد حسابے ندارد، دیگراں ہم امیدوار چنیں مراحم بودند، بادشاہ او را گذشتہ بآنہا متوجہ شد۔"

لیں گے کہ واقعی دیندار ہے۔ جب نماز کا وقت تنگ ہونے لگا تو اس نے ناچار عرض کیا، بادشاہ نے کہا قضا پڑھ لینا' کیا مجھے تنہا چھوڑ دو گے؟ شہباز خاں نے بے اختیار اپنا ہاتھ کھینچ لیا اور دوپٹہ زمین پر ڈال کر نماز شروع کر دی اور اس کے بعد ورد میں مشغول ہو گیا۔ بادشاہ برابر اس کے سر پر ہاتھ مارتا جاتا تھا کہ اٹھو۔ حکیم ابوالفتح نے (دل میں) کہا کہ یہ انصاف کی بات نہیں کہ اس شغل عزیز میں خلل واقع ہو۔ چنانچہ آگے بڑھا اور عرض کیا: بادشاہ سلامت تنہا ایک شخص پر اس درجہ لطف و نوازش کہ کوئی حد ہی نہیں حالانکہ دوسرے بھی اس لطف و رحمت کے امیدوار ہیں۔ بادشاہ اس کو چھوڑ کر حکیم کی طرف متوجہ ہو گیا۔

——— بے دینی کے الزام کی تردید ان خطوط سے بھی ہوتی ہے جو رقعات ابوالفتح گیلانی

[1] غالباً یہ واقعہ ان دنوں کا ہے جب اکبر الحاد و زندقہ میں مبتلا ہو چکا تھا۔ [2] اس سے حکیم کی دینی و ایمانی غیرت ظاہر ہوتی ہے۔

میں موجود ہیں۔ میں یہاں چند خطوط درج کرتا ہوں۔ ایک خط میں حکیم ابوالفتح حکیم ہمام کو لکھتا ہے:[1]

"دل بخدائے خود پیوستہ دار و از یاد او از برادر خود نگسستہ باش، برخواہش خود خواہش او را مقدم دار و دل تنگ مباش۔ بہ جملگی باطن و ظاہر خود او را باش و بہ تربیت نفس ناطقہ مشغولی ورزو بعجائب نفس بینا شو من بعد خود را ایلچی مداں و بر مخالف نفس صبور باش و مطالعہ احیاء و کیمیا را از دست مدہ و بجز سخن خداپرستاں مشنو و مگو و بغیر ازیں طائفہ جلسہ و خلطہ باکسی آمیزش مکن و مرا در رنگ آنکہ گذاشتہ رفتہ بودی کشتہ و مردۂ دنیا میداں و در غم من مباش و فرزندان خود را درا رض خدا نہان و ولی نعمت حقیقی واں و از ہیچ کس در بیم و امید مرو و یقین داں کہ اگر چنیں باشی در سمرقند و بخارا نیستی و اگر حاشا غیر ایں معنی مذکور طبع باشد در عین شہر لاہیجان در دامن پدر و مادر بی غمخواری۔ حق تعالیٰ در ہمہ جا و در ہمہ حال ناصر و معین تو باشد۔"

اس خط کی ایک ایک سطر سے صاف عیاں ہے کہ اس کا لکھنے والا نہ صرف یہ کہ مذہبی بلکہ خداترس بھی ہے۔ جو شخص تربیت نفس کے لیے اپنے بھائی کو امام غزالی کی احیاء العلوم اور کیمیائے سعادت کے مطالعہ کے ساتھ خداپرستوں کی صحبت نشینی کی تلقین کرتا ہے اور خدا کے سوا کسی دوسرے سے نفع و ضرر کی امید نہ رکھنے کی ہدایت کرتا ہے اس کے بارے میں یہ کیونکر باور کیا جا سکتا ہے کہ وہ مذہب سے بیگانہ اور ملحد ہوگا۔ ایک دوسرے خط میں حکیم ہمام کو لکھتا ہے:[2]

[1] رقعات ابوالفتح گیلانی ص ۳۹-۱۳۸، خط نمبر ۵۹، مورخہ ۸ جمادی الثانی ۹۹۱ ہجری (بقیہ حاشیہ ص ۵۴)

"اے برادر، کہ در ظلمات طبیعت بغم زن و فرزند درماند، ماند، بیت:

زن و فرزند بندہ ایست خدا را غمش مخور — تو کیستی کہ بہ ز خدا بندہ پروری

حق تعالیٰ شما را بقضا و قدر خورسندی بخشد و کردار ما را موافق گفتار ما گرداند۔

تا از اصحاب "یقولون بالسنتہم مالیس فی قلوبہم (فتح-۱۱) نباشیم"

گفتار اور کردار میں مطابقت کی بات کرنے والے کو غیر مذہبی اور ملحد کون کہہ سکتا ہے اور کیسے یقین کیا جا سکتا ہے کہ وہ اکبر بادشاہ کو منکرات اور اباطیل کی طرف ترغیب دیتا تھا اور اسے گمراہ کرتا تھا اور کس طرح تسلیم کر لیا جائے کہ وہ ہندۂ درہم وہ دینار تھا جیسا کہ بدایونی نے لکھا ہے۔

خواجہ حسین ثنائی نے بستر مرگ سے حکیم کو خط لکھا جس میں بیوی بچوں کے بارے میں اندیشہ ہائے دور دراز کا اظہار کیا گیا تھا۔ جواب میں حکیم نے اسے تسلی دی کہ اس راہ سے سب کو گذرنا ہے اور اس حادثہ سے سب کو دوچار ہونا ہے۔ خدا کے یہاں جو چیز مطلوب ہے وہ عجز و مسکنت، شکستگی اور نیازمندی ہے اور اس متاع عزیز سے تم تہی دامن نہیں ہو اس لیے خدا کی طرف سے جو کچھ بھی پیش آئے اس پر راضی و شاکر رہو اور غم فرزنداں و یاراں سے بے نیاز کہ خدا ان کا نگراں و نگہبان ہے۔ خط کے الفاظ ملاحظہ فرمائیں:[1]

"ایں راہ ہمہ را در پیش است۔ فرزندان خود را بہ خدا بسپارید و از مخلوقات خاطر جمع دارید کہ تربیت کنندہ خدا است۔ بدرگاہ عظمی کہ متوجہ اند، چیزی

(بقیہ حاشیہ ص ۵۳) [2] رقعات ص ۱۲۵ مورخہ ماہ شوال ۹۹۶ھ (حاشیہ صفحہ ہٰذا) [1] رقعات ابوالفتح ص ۱۲۱ خط نمبر ۵۰ مکتوبہ ۱۰ رمضان المبارک۔

می طلبند کہ نداری۔ عجز و مسکنت و شکستگی و نیازمندی می طلبند۔ الحمد للہ کہ ایں متاع خانہ شما است۔ از ہر چہ خدا کردہ کند راضی و شاکر باش۔ صحت و مرگ را برابر انگار۔ غم فرزنداں و یاراں مخور کہ آنہا ہمچو شما در حفظ حمایت الٰہی محفوظ اند۔"

ان خطوط کی روشنی میں پورے اعتماد و یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ حکیم ابوالفتح کے اخلاق کے بارہ میں ملا عبدالقادر بدایونی نے جو کچھ لکھا ہے وہ غلط اور بے بنیاد ہے،

حکیم کا مذہب | مولف نزہتہ الخواطر نے لکھا ہے کہ حکیم مذہب اثنا عشری رکھتا تھا[1] لیکن رقعات سے جیسا کہ اوپر بیان ہوا، معلوم ہوتا ہے کہ امام غزالی کی احیاء و کیمیا دونوں برابر اس کے مطالعہ میں رہتی تھیں اس سے اس خیال کی تردید ہوتی ہے لیکن اس باب میں بالیقین کچھ کہنا مشکل ہے۔

تصنیفات | حکیم ابوالفتح نے درج ذیل کتابیں تالیف کیں:

(۱) فتاحی: یہ قانونچہ (علامہ چغمینی) کی بسیط شرح اور ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ مولوی محمد حسین آزاد نے اس کی تحسین ان لفظوں میں کی ہے:[2]

"شیخ سینا کی روح کو آب حیات پلایا اور گویا اسے زندۂ جاوید کر دیا ہے۔"

(۲) قیاسیہ: یہ اخلاق ناصری[3] کی شرح ہے اور ۴۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ حکیم ابوالفتح نے اس کتاب کے ایک ایک مسئلہ کو جو براہین فلسفہ پر مبنی ہیں، دلائل

[1] نزہتہ الخواطر ج ۴ ص ۱ [2] دربار اکبری ص ۷۹۶ [3] اخلاق ناصری مشہور عالم ہیئت اور فلسفی نصیر الدین طوسی کی تالیف ہے۔ نصیر الدین طوسی ۵۹۷ ہجری میں طوس میں پیدا ہوئے اور ۶۷۳ ہجری میں بغداد میں فوت ہوئے۔

نقلی سے ثابت کیا ہے اور آیتوں اور حدیثوں سے مطابقت دی ہے مولوی محمد حسین آزاد لکھتے ہیں:[1]

"اخلاق ناصری کی شرح حکمت و شریعت کی دو نہریں ہیں۔ حقیقت میں اس کے ایک ایک مسئلہ کو جو فلسفیانہ براہین پر قائم ہیں، دلائل نقلی سے مبرہن کیا ہے"

(۳) چار باغ: یہ حکیم کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو اس نے ۹۸۳ ہجری سے ۹۹۷ ہجری کے عرصہ میں اپنے مخصوص احباب اور اہل خاندان شلاً خانخاناں، میراں صدر خوافی خاں، شاہ منصور، میر شریف آملی، خواجہ حسین ثنائی، خواجہ عطا بیگ، حکیم لطف اللہ اور حکیم ہمام وغیرہ، سب سے زیادہ خطوط حکیم ہمام کے نام ہیں۔ یہ خطوط بے تکلفی اور سادہ نگاری کے عمدہ نمونے ہیں۔ اسلوب تحریر فیضی کے اسلوب سے بڑی مشابہت رکھتا ہے۔ اس کے خطی نسخے ایشیاٹک سوسائٹی بنگال اور بمبئی یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود ہیں۔

(۴) رقعات ابوالفتح گیلانی: اس کا تذکرہ گذشتہ صفحات میں ہو چکا ہے۔ اس کا ایک قلمی نسخہ آزاد لائبریری (مسلم یونیورسٹی علی گڈھ) میں موجود ہے۔[2]

(۵) طب ابوالفتح: یہ حکیم کے معمولات و مجربات کا مجموعہ ہے۔ ابھی تک غیر مطبوعہ ہے۔ اسٹوری کے بیان کے مطابق یہ کتاب رسالہ طب المجربات کے نام سے لاہور یونیورسٹی (پاکستان) میں موجود ہے اور اس کا نمبر ا ہے[3]۔ خدا بخش لائبریری کی طرف سے "پاکستان کے کتب خانوں میں غیر مطبوعہ مخطوطات" کے نام سے جو کتابچہ شایع ہوا ہے اس میں

---

[1] دربار اکبری ص۹۶۰ [2] ڈاکٹر محمد بشیر حسین کی تصحیح کے ساتھ ۱۹۶۸ء میں یہ کتاب لاہور سے شایع ہو چکی ہے۔ [3] پرشین لٹریچر ج ۲ ص ۲۲۹۔

بھی پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں اس کی موجودگی ظاہر کی گئی ہے۔[1]

افادات حکیم ابوالفتح — مختلف موضوعات پر حکیم کے افکار و خیالات کا مجموعہ ہے اس کا ایک خطی نسخہ تہران میں ڈاکٹر اصغر مہدی کے پاس موجود ہے۔[2]

حکیم کوثر چاندپوری نے اپنی کتاب "اطبائے عہد مغلیہ" میں حقے کی ایجاد کو حکیم ابوالفتح کی طرف منسوب کیا ہے۔ جو صحیح نہیں ہے۔ اس کا تعلق حکیم عین الملک شیرازی متخلص دوائی سے ہے۔[3]

اولاد — حکیم کے ایک بیٹے کا نام فتح اللہ[4] تھا جیسا کہ حکیم ہمام کے نام ایک خط میں مذکور ہے۔[5] "بندہ زادہ شما فتح اللہ تسلیم کردہ دعای دوام دولت دارین عرض نمانید"۔ رقعات میں حکیم کے دو اور بچوں کے نام ملتے ہیں۔ ایک لڑکا ابوالوفا اور دوسری لڑکی عائشہ بانو۔ ایک خط میں ان تینوں کا ذکر موجود ہے۔ "فرزندان بصحت و سلامت اند، فتح اللہ وابوالوفا[6] و عائشہ بانو تسلیم کردہ بندگی میرسانند، فتح اللہ بسیار ترقی کردہ" فتح اللہ کا ذکر اس خط میں بھی ہے جو خواجہ حسین ثنائی کے نام ہے۔[7] "فرزند فتح اللہ کہ بسر رشتہ داد

---

[1] دیکھیں، کتابچہ مذکور ص۵ [2] نشریہ کتبخانہ مرکزی دانشگاہ تہران ج ۲ ص۱۰۱ [3] اکبرنامہ (قلمی) اسعد بیگ ص ۹۰-۹۳ بحوالہ دربار ملی ص ۱۸۱-۱۸۳ [4] حکیم کا یہ لڑکا جہانگیر کے عہد میں کابل کے مقام پر خسرو کی سازش کے الزام میں سازش کے دوسرے شرکا کے ساتھ گرفتار ہوا اور بطور سزا گدھے پر الٹا سوار کرا کے منزل بہ منزل گھمایا گیا اور آخر میں اندھا کر دیا گیا، ملاحظہ ہو: مآثر الامراء ج ا ص۵۵۹، اقبال نامہ جہانگیری ج ا ص۲۹ و دربار اکبری ص۶۶۶ [5] رقعات ص۱۱۲ [6] تو زک جہانگیری میں فتح اللہ اور ابوالوفا دونوں کا ذکر ہے، دیکھیے ص ۵۸، ۷۶ [7] رقعات ص۱۲۹۔

وفا وحقیقت است، ہمیشہ یاد میکند وسلام میرساند۔"

وفات | ۹۹۷ھ مطابق ۱۵۸۹ء میں جب اکبر کشمیر کی سیاحت پر گیا تو جو امراء واعیان سلطنت اس کے ساتھ تھے ان میں حکیم ابوالفتح بھی تھا۔[1] ۲۷ رمضان ۹۹۷ھ کو اکبر کشمیر سے سیر وتفریح کی غرض سے کابل کی طرف روانہ ہوا۔ راستے میں حکیم کو مرض اسہال لاحق ہوا۔ بادشاہ خود اس کی عیادت کے لیے گیا۔ علاج کے باوجود مرض میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہانتک کہ دمتور[2] پہنچ کر ۱۹ شوال، ۹۹۷ ہجری کو حکیم نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ بادشاہ کے حکم سے اس کو حسن ابدال[3] کے شاداب وپرفضا مقام پر اس گنبد میں دفن کیا گیا جسے خواجہ شمس الدین خوافی نے اپنے لیے بنوایا تھا۔[4] جہانگیر توزک میں لکھتا ہے[5]:

"خواجہ شمس الدین محمد خانی کہ مدتے بشغل وزارت والد بزرگوارم مشغول داشت، صفہ بستہ وحوضی درمیان آں ترتیب دادہ کہ آب چشمہ آنجا درمی آید واز انجا بزراعت وباغات صرف می شود۔ بر کنار ایں صفہ گنبدی بجہت مدفن خود ساختہ بود، بحسب اتفاق نصیب اُو نشد وحکیم ابوالفتح گیلانی وبرادرش حکیم ہمام راکہ در

[1] اکبر نامہ ج ۳ صفحہ ۵۳۶ [2] دمتور ایبٹ آباد (پاکستان) سے تقریباً پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ایک چھوٹی سی بستی ہے [3] حسن ابدال کے جائے وقوع کے متعلق حکیم کوثر چاند پوری کا بیان صحیح نہیں ہے۔ حسن ابدال پنجاب کے بجائے صوبہ سرحد میں پشاور کے قریب ایک منزل کا نام ہے جو بابا حسن ابدال کے نام سے موسوم تھی۔ کیونکہ اسی کے قریب ہی ان کی خانقاہ واقع تھی۔ تفصیل کے لیے دیکھیں: توزک جہانگیری ص۴۸ [4] مآثر الامراء ج ۱ ص ۵۵۷ و اکبر نامہ ج ۳ ص ۵۶۰ [5] توزک جہانگیری ص ۴۸۔

خدمت والد بزرگوارم نسبت مصاحبت وقرب ومحرمیت تمام داشتند حسب الحکم آنحضرت دراں گنبد نہادہ اند۔"

ملا عبدالقادر بدایونی کو حکیم سے اس درجہ بغض وعناد تھا کہ وفات کے بعد بھی اسے اچھے الفاظ سے یاد نہ کیا اور "خدالیش سزا دہاد" سے اس کی تاریخ وفات نکالی۔[1] لیکن دوسرے معاصرین کا طرز عمل اس سے قطعاً مختلف تھا۔ ہر ایک نے اس دانائے روزگار کی بے وقت موت پر اظہار تاسف کیا۔ درباری شعراء نے سوز وگداز میں ڈوبے ہوئے مرثیے کہے۔ حکیم کی وفات سے چند روز قبل شاہ فتح اللہ شیرازی کا انتقال ہوا تھا۔ فیضی نے ان دونوں افاضل وقت کا جو مرثیہ کہا اس کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:[2]

اول امام دین عضد الدولہ بحر علم	قرابہ حقائق وعلامہ زماں
دیگر حکیم عہد ابوالفتح آنکہ بود	مجموعۂ معانی ودیباچۂ بیاں
وا حسرتا کہ رفت فلاطون دوربیں	وا عبرتا کہ مرد ارسطوی کارداں
یارب چہ گویم وچہ نویسم ز درد دل	بر کبریای علم الٰہی بودعیاں
در موقف قضاش تو داتی نظر بداد	در مشہد رضاش تو ثابت قدم بجان

عرفی نے بھی حکیم کی وفات پر ایک دردانگیز مرثیہ کہا جس کے چند تعزیتی شعر درج ہیں:[3]

دریں مصیبت عظمیٰ کہ دہر سنگیں دل	زگریہ ہر سو مو چشم خوں فشاں آمد
کہ دہبرش بعدم شد کہ مرگ در مرگش	سیاہ پوش تر از عمر جاوداں آمد
تو آگہی کہ مراز غروب ایں خورشید	چہ گنجہائے سعادت زیاں جاں آمد

[1] منتخب التواریخ ج ۲ ص ۳۰۷ [2] اکبر نامہ ج ۳ ص ۵۹۹ و کلیات فیضی ج ۲ ص ۱۰۷

[3] دیوان عرفی ص ۲۲۔

شہنشاہ اکبر کو حکیم کی ناگہانی موت سے جو صدمہ پہونچا تھا اس کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ کابل سے واپسی پر "باریک آب" کے مقام پر جب اس کی ملاقات حکیم ہمام سے ہوئی جو توران کی سفارت سے واپس ہوا تھا تو اس نے ان الفاظ میں دلجوئی کی[۱]: ترا یک برادر بود از عالم رفت و ما را ده ؎

از حساب دو چشم یک تن کم　　وز شمار خرد ہزار ان بیش

اور جب وہ (بادشاہ) حسن ابدال پہونچا تو حکیم کی قبر پر فاتحہ خوانی کیلئے گیا[۲]۔

[۱] ماثر الامراء ج ۱ ص ۵۵۷　[۲] ایضاً

حکمائے اسلام

حصہ اول

جس میں یونانی فلسفہ کے تاریخی مآخذ، فلسفہ ارسطو اور حکمائے قدیم کے فلسفیانہ مذاہب و مسلمانوں میں علوم عقلیہ کی اشاعت اور ان کے اہم بڑے مراکز کی مختصر تاریخ اور پانچویں صدی تک کے اکابر حکمائے اسلام کے مستند حالات، ان کی علمی خدمات اور ان کے فلسفیانہ افکار و نظریات کی تفصیل بیان کی گئی ہے۔

قیمت :- ۳۳ روپیے۔

حکمائے اسلام

حصہ دوم

جس میں متوسطین و متاخرین حکمائے اسلام مثلاً عمر خیام، ابن باجہ، ابن طفیل، ابن رشد، امام رازی، جرجانی اور ہندوستان کے حکماء مثلاً ملا نظام الدین، ملا حسن، مولانا فضل امام خیرآبادی وغیرہ کے مستند حالات ان کی علمی خدمات اور ان کے فلسفیانہ نظریات کی تفصیل درج ہے۔

مولفہ۔ مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم

قیمت :- ۲۵ روپیے

اموی دور کی غزلیہ شاعری

از جناب محمد سمیع اختر صاحب ریسرچ اسکالر شعبہ عربی مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

غزل شاعری کی اہم صنف ہے جو دنیا کی تقریباً تمام مشہور زبانوں میں کسی نہ کسی صورت میں موجود رہی ہے اور دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان کے اندر آج بھی غزلیات کا وافر ذخیرہ موجود ہے، عربی شاعری کا سرمایہ بھی اس سے خالی نہیں، ہر دور کے شعرا نے اس میں طبع آزمائی کی ہے، افکار و خیالات، الفاظ و تشبیہات اور اسلوب و فن کے اعتبار سے ہر دور کی غزلیہ شاعری کی کچھ نمایاں اور امتیازی خصوصیات ہیں۔

عربی میں غزل کی ابتدا عہد جاہلیت ہی میں ہو گئی تھی اور ظہور اسلام سے پہلے ہی اس نے عروج و ارتقا اور پختگی و بلندی کے مدارج طے کر لیے تھے۔

جاہلی دور میں غزلیہ اشعار عموماً قصائد کے شروع میں تشبیب کے طور پر آتے تھے۔ اس کے لیے غزل، نسیب، تشبیب اور تغزل جیسے الفاظ مروج تھے، جن کے بنیادی مفہوم میں کوئی خاص فرق نہیں ہے بلکہ ان سب کی غایت عورت کے متعلق محبت آمیز جذبات اور عشقیہ خیالات کا اظہار و ترجمانی ہے۔ جاہلی شاعری میں مدح، فخر، حماسہ اور مرثیہ کی طرح تشبیب و تغزل کے اشعار بھی بکثرت ملتے ہیں جن کی ادبی قدر و قیمت، جدت و تازگی اور لطافت و نزاکت میں صدیاں گزرنے کے بعد بھی کوئی فرق نہیں آیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود جاہلی دور میں غزل نے علٰحدہ صنف سخن کی حیثیت نہیں حاصل کی تھی۔

غزل کو ایک مستقل صنفِ سخن کی حیثیت اموی دور میں جا کر حاصل ہوئی۔

اموی دور میں خلفا نے فتوحات کی طرح علوم و فنون اور شعر و سخن کی ترقی کی جانب بھی توجہ کی۔ ان کی سرپرستی کی وجہ سے شعرا نے بھی شاعری کو اپنا مرکزِ توجہ بنایا اور اس کے قدیم موضوعات میں وسعت دے کر بعض نئے اصنافِ کلام کا اضافہ بھی کیا، مورخین اور ناقدین نے بنیادی طور پر اموی دور کی غزل گوئی کی دو قسمیں قرار دی ہیں (۱) عذری غزل گوئی (۲) اباحی غزل گوئی۔

عذری مکتبہ شاعری اسلام نے محبت کے فطری جذبہ کو نہ تو ختم کیا اور نہ ہی اسے اخلاقی اور مذہبی حدود سے تجاوز کرنے کی اجازت دی ہے۔ اس نے انسانی فطرت کے اس لطیف جذبہ میں اعتدال پیدا کرنے کیلئے کچھ اخلاقی اصول متعین کیے اور عفت و پاکیزگی کی قید عائد کی جن کے اندر رہتے ہوئے شعرا کو اپنے جذبات کے اظہار کی اجازت دی۔ عذری غزل گوئی عشق و محبت کے پاکیزہ انسانی جذبات کو فنی باریکیوں کے ساتھ ادا کر دینے کا نام ہے۔ شاعری کی اس طرز کی نمائندگی کچھ ایسے شعرا کر رہے تھے جو تشبیب کے باوجود طہارت، عفت، متانت اور شرافت کے اصولوں اور اسلامی تعلیمات کی پوری رعایت کرتے تھے۔ اس طرز فکر کے شعرا عارضی محبت کے قائل نہیں تھے بلکہ ان کے جذبات میں دوام اور بقا کا عنصر شامل ہوتا تھا۔ ان کا محبوب وقت اور زمانے

۱۔ یہ قبیلہ بنو عذرہ کی طرف نسبت ہے۔ جو اپنی پاکیزہ اور سچی محبت کے لیے مشہور تھا۔ کہا جاتا ہے کہ اس قبیلے کے لوگ جب محبت کرتے تو اس راہ میں مر جانا گوارا تھا مگر محبوب کی رسوائی یا پیچھے ہٹ جانا منظور نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ پاکیزہ اور سچی محبت کے اظہار کے لیے اس لفظ کو خاص کر لیا گیا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ تمام شعرا کا تعلق اسی قبیلے سے ہو۔ (ادباء العرب۔ بطرس بستانی صفحہ ۲۸۶)

کے ساتھ تبدیل نہیں ہوتا ہے بلکہ جسے وہ پسند کرتے ہیں اس سے وہ تاحیات محبت کا دم بھرتے ہیں مگر اپنے جذبات کے اظہار میں کبھی کوئی ایسی بات زبان پر نہیں لاتے جو محبوب کی رسوائی یا بدنامی کا سبب بنے یا جو اسلامی اخلاق و پاکیزگی کے اصول سے فروتر ہو۔ وہ محبوب کے ساتھ تشبیب کرتے ہوئے اپنے جذبات و خیالات کو بے لگام نہیں چھوڑ دیتے بلکہ ان کو اعلیٰ انسانی و روحانی اقدار کا پابند بناتے ہیں وہ محبوب کے ظاہری محاسن، عارضی حسن، فانی شباب کی طرف توجہ نہ دیتے ہوئے اس کے اعلیٰ اخلاق و کردار اس کے عمدہ عادات و اطوار، اس کی حیا اور عفت کی تعریف کرتے ہیں، وہ لوگ فحش گوئی اور بوالہوسی کے جذبات کے اظہار سے گریز کرتے ہیں۔ ایسے شعرا کی اکثریت نجد و حجاز کے علاقے میں آباد تھی۔ ان شعرا کی شعری خصوصیات ایک دوسرے سے بہت حد تک ملتی جلتی ہیں۔ جمیل بن معمر اس مکتبۂ فکر کا بانی اور روحِ رواں کہلانے کا مستحق ہے۔ اس کے بعد کے تمام شعرا کے اشعار میں فکری و فنی دونوں اعتبار سے جمیل کی خوشہ چینی کے اثرات نظر آتے ہیں۔ ان تمام شعرا کی داستانِ عشق بھی ایک دوسرے کے مشابہ ہے کہ شاعر کی کسی خوبصورت لڑکی پر نظر پڑتی ہے، وہ اس کے عشق و محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے، جدائی کے عالم میں اس کے ساتھ تغزل شروع کر دیتا ہے معاملہ کچھ اور آگے بڑھتا ہے، شاعر اس کے گھر والوں کو شادی کا پیغام بھیجتا ہے، محبوب کے گھر والے زمانے کی لعن طعن کے خوف اور خاندانی شرف و مجد کی دیوار کھڑی کر کے شادی سے انکار کر دیتے ہیں۔ آخر کار شاعر مایوسی، بے بسی اور ناامیدی کے عالم میں سنسان علاقوں اور ویران وادیوں کا رخ کرتا ہے اور اپنے اوپر طاری حالات کو اشعار کا قالب عطا کرتا ہے۔ پھر ہجر و فراق کے ان جانگداز لمحات میں بے رحم موت کے آہنی پنجے اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں اور وہ

ہر طرح کی دنیوی کلفتوں اور پریشانیوں سے آزاد ہو جاتا ہے۔ اس مکتب فکر کے مشہور غزل گو شعرا میں جمیل بن معمر (صاحب بثینہ)، قیس بن ذریح (صاحب لبنیٰ)، مجنون عامری (صاحب لیلیٰ)، توبہ بن حمید، قیس بن ملوح وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔[1]

جمیل بن معمر حجاز کے مشہور علاقے وادی القریٰ میں پیدا ہوئے۔ تذکرہ نگاروں نے اس کی تاریخ پیدائش کے سلسلے میں کوئی قطعی بات نہیں کہی ہے۔ پورا نام جمیل بن عبداللہ بن معمر عذری ہے۔ وادی القریٰ ہی میں اس کی دنیائے دل کی ملکہ اور اس کی زندگی کی متضاد مقصود بثینہ بھی رہتی تھی۔ یہیں کی سرسبز وادیوں میں ان کی پاکیزہ محبت پروان چڑھی اور عہد طفولیت ہی میں دونوں ایک دوسرے سے بہت زیادہ قریب ہو گئے۔ "وادی بغیض" میں دونوں ایک ساتھ اپنی اونٹنیاں چرایا کرتے تھے۔ اس وادی کا تذکرہ اس کے اشعار میں جا بجا ملتا ہے۔[2] شباب کے مرحلے میں داخل ہوتے ہی دونوں کے عشق و محبت میں پختگی آئی۔ جمیل کی سوزش عشق میں برابر اضافہ ہوتا گیا۔ خاندان اور قبیلے میں رسوائی اور بدنامی کے خوف سے بثینہ کو گھر کی چہار دیواری میں قید کر دیا گیا۔ جمیل نے اس کے گھر والوں کو اپنی شادی کا پیغام بھیجا جسے مسترد کر دیا گیا۔ اور بثینہ کی شادی کسی دوسرے شخص کے ساتھ کر دی گئی۔ اس طرح اس کی خواہشوں اور تمناؤں کا خون ہو گیا اور پھر اسے اپنا بھی ہوش نہیں رہا۔ بثینہ کے دل میں بھی عشق کی سوزش جمیل سے کچھ کم نہ تھی۔ دونوں نے رات کی تاریکی میں دنیا سے چھپ کر ملاقات کا منصوبہ بنایا۔ بثینہ کے خاندان والوں کو اس معاملے کی خبر ہو گئی۔ ان لوگوں نے مروان بن حکم سے اس کی شکایت کر دی۔ چنانچہ سلطان نے اس کا خون کر دیا اور اس کی زبان کاٹنے کا حکم صادر کیا۔[3] قتل کے ڈر سے مدینہ چھوڑ کر وہ شام اور یمن کے علاقوں کی طرف بھاگ گیا۔

---

[1] تاریخ الادب العربی۔ حنا فاخوری ص ۲۳۲ [2] ادباء العرب۔ بطرس بستانی ص ۲۸۰ [3] تطور الغزل بین الجاہلیۃ والاسلام ص ۲۴۳

مروان کی معزولی کے بعد وہ وطن لوٹا مگر یہاں اس کا دل نہ لگا اور وہ مصر چلا گیا اور وہیں گمنامی کی زندگی گذارتے ہوئے اسے ایسا مرض لاحق ہو گیا جو اس کی موت کا سبب بنا۔ جمیل کے بارے میں اکثر تذکرہ نگاروں کا بیان ہے کہ اس نے نہ کبھی شراب کو ہاتھ لگایا اور نہ کسی گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا بلکہ اسلامی احکام کی پابندی کرتا رہا۔[1]

جمیل کی شاعری تاریخ و ادب کی متعدد کتابوں میں جمیل کے اشعار بکھرے پڑے ہیں۔ انکی شاعری کا بڑا حصہ غزلیات پر مشتمل ہے۔ ابن خلکان کے زمانے میں اس کے اشعار کا ایک ضخیم دیوان موجود تھا جو ضایع ہو گیا۔ اس کے اشعار پر مشتمل ایک مخطوطہ برلین کی لائبریری میں آج بھی موجود ہے۔[2]

جمیل بن معمر نے عربی غزل گوئی کو ایک نیا رخ دینے کی کوشش کی۔ اس کے تغزل کا رنگ امرء القیس، زہیر، طرفہ اور دیگر جاہلی شعرا کی غزل گوئی سے مختلف ہے۔ وہ اپنے اشعار میں بوسیدہ کھنڈرات، ہرن کی مینگنیوں یا محبوب کے جسمانی حسن و جمال کا ذکر نہیں کرتا بلکہ محبت کے لطیف جذبات، پاکیزہ خیالات اور اندرونی احساسات کے تاروں کو چھیڑنے کی کوشش کرتا ہے وہ عشقیہ خیالات کے اظہار میں بے باکی دکھانے کے بجائے عفت و اخلاق کے دامن کو کبھی اپنے ہاتھ سے چھوٹنے نہیں دیتا۔ اس کے اشعار میں فطری سادگی اور راست گوئی کے ساتھ ساتھ شعری لطافت اور فنی جدت و ندرت کا بھی وافر ذخیرہ موجود ہے اسکے خیالات میں ابہام و پیچیدگی کے بجائے وضاحت و صفائی کا عنصر غالب ہے۔ وہ نادر تشبیہات واستعارات کا سہارا لینے کے بجائے اپنی بات کو عام اور فطری انداز میں سادگی سے بیان کرتا ہے۔

---

[1] شذرات الذہب فی اخبار من ذہب۔ عبدالحئی بن عماد۔ ج ا ص ا و [2] ادباء العرب۔ ص ۲۸۸۔

اس کے اشعار کی ایک بڑی خصوصیت مقصد کی وحدت ہے۔ تغزل سے متعلق اسکے تمام اشعار کا مرکز و محور "بثینہ" کی ذات ہے جس کا مرض بھی بثینہ ہے اور اس کی دوا بھی وہی ہے۔ اس کے اشعار میں زندگی کی امنگ اور امید کے بجائے یاس و ناامیدی کا پہلو غالب نظر آتا ہے۔ وہ اپنے اشعار کے اندر زیادہ تر اپنے رنج والم اور غم و اضطراب کی کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے۔ اس کے اشعار سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بثینہ کے ساتھ اس کی محبت کسی وقتی رد عمل یا اتفاقی حادثے کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ یہ کبھی تبدیل نہ ہونے والی ایک حقیقت تھی۔ اسلیے اس کے جذبۂ عشق و محبت کی چنگاریاں ہمیشہ بھڑکتی رہتی ہیں۔ اس کے مندرجۂ ذیل اشعار میں ہجر و فراق اور الم و کلفت کے انہی جذبات کی ترجمانی کی گئی ہے۔

ألا ليت شعري هل أبيتن ليلةً   بوادِ من القرى، أني اذاً لسعيد

(سنو! کاش مجھے وادی قریٰ میں ایک رات گذارنے کا موقع مل جاتا تو میں اپنے آپکو سب سے زیادہ خوش قسمت انسان تصور کرتا۔)

وهل ألقين فرداً، بثينة مرةً   تجود لنا من ودها ونجود

(کاش میں ایک بار بثینہ سے تنہائی میں مل پاتا تاکہ ہم دونوں ایک دوسرے سے کھل کر اپنی محبت کا اظہار کر پاتے)

علقت الهوى منها وليداً فلم يزل   الى اليوم ينمي حبها ويزيد

(میں بچپن ہی سے اسکی محبت میں گرفتار ہو گیا اور آجتک اسکی محبت میرے دل میں نہ صرف باقی ہے بلکہ برابر بڑھتی ہی جا رہی ہے۔)

وأفنيت عمري بانتظار من وعدها   وأبليت فيها الدهر وهو جديد[1]

(میں نے اسکے وعدے کے انتظار میں پوری زندگی ختم کر دی اور اسکی محبت میں زمانے نے مجھے ہمیشہ ایک نئے غم سے دوچار کیا۔)

ایک دوسری جگہ راہ عشق میں اپنی مجبوری و بے بسی کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے۔

وقد قلت في حبي لكم وصبابتي   محاسن شعر ذكرهن يطول

---

[1] کتاب الاغانی۔ ج ۷۔ ص ۸۳۔

(میں نے تمہارے عشق و محبت میں عمدہ اشعار کہے اور اس سلسلے کو مزید آگے بڑھایا)

فإن لم يكن قولي رضاك فعلّمي   هبوب الصبا، يا بثن، كيف أقول

(اگر میرے اشعار تمہارے لیے پریشانی کا سبب بنتے ہیں تو اے بثینہ! تم ہی بتاؤ کہ میں اپنے سوز عشق کا اظہار کیسے کروں!)

فما غاب عن عيني خيالك لحظةً   ولا زال عنها، والخيال يزول[1]

(میری آنکھوں کے سامنے سے تری تصویر ایک لمحے کے لیے بھی غائب نہیں ہوتی اور تیرا خیال بھی ہمیشہ میرے ساتھ رہا۔)

ذیل کے اشعار کی سادگی و پرکاری ملاحظہ ہو۔

يقولون جاهد، يا جميل بغزوةٍ   وأي جهاد غيرهن أريد

(لوگ مجھ سے جنگ و جہاد کی باتیں کرتے ہیں، بھلا ان کی چاہت سے بڑھ کر کون جہاد ہو سکتا ہے)

لكل حديث عندهن بشاشة   وكل قتيل بينهن شهيد[2]

(ان کی محفل میں ہونے والی ہر گفتگو باعث فرحت و مسرت ہے اور ان کی جستجو میں مرنے والا ہر شخص شہید ہے۔)

پھر وہ اپنی محبت اور وفا کی صداقت کا یقین دلاتے ہوئے کہتا ہے۔

يا ليتني ألقى المنية بغتةً   إن كان يوم لقائكم لم يقدر

(اگر تمہاری ملاقات میرا مقدر نہیں تو ایسی زندگی سے کیا حاصل، کاش مجھے اچانک موت ہی آ جائے۔)

يهواك ما عشت الفؤاد فإن أمت   يتبع صداي صداك بين الأقبر[3]

(جب تک میں زندہ ہوں یہ دل تمہاری محبت ہی میں دھڑکے گا، اگر میں مر گیا تو قبروں کے درمیان میری آواز تمہارا پیچھا کرے گی۔)

قیس بن ذریح

اس عذری مکتبۂ فکر کا دوسرا بڑا شاعر قیس بن ذریح ہے۔ اس کی پیدائش کی تاریخ تو نہیں معلوم مگر اس کی وفات ۶۸ ہجری میں ہوئی۔[4] اس کے عشق و محبت کی داستان۔

---

[1] کتاب الاغانی۔ ج ، ص ۹۸ [2] ایضاً ص ۸۵ [3] الغزل منذ نشأته حتی صدر الدولة العباسیة۔ ج ۱۔ الدکتور سامی دھان واحبابہ۔ ص ۳۶ [4] الاعلام۔ ج ۵۔ ص ۲۰۵

بھی جمیل کی داستان محبت سے بہت حد تک ملتی جلتی ہے۔ کسی سفر کے دوران لبنیٰ نام کی کسی خوبصورت لڑکی پر اس کی نظر پڑی اور پھر وہ اس کے عشق میں گرفتار ہوگیا۔ اس نے لبنیٰ سے شادی کرنا چاہا لیکن دونوں کے خاندانوں کے سربراہ اس ارادہ میں حائل ہوگئے۔ آخر کار قیس نے حسین بن علی سے جو اس کے رضاعی بھائی تھے اس معاملے میں ثالثی کا فریضہ انجام دینے کی درخواست کی جس کے بعد دونوں کی شادی ہوگئی لیکن خوشی کے یہ لمحات دیرپا ثابت نہیں ہوئے اور قیس کو اپنے خاندان والوں کے ہاتھوں مجبور ہوکر بادل ناخواستہ لبنیٰ کو طلاق دینی پڑی اور پھر پوری زندگی وہ حسرت وندامت کی آگ میں جلتا رہا۔ اس کے غزلیہ اشعار میں بھی سادگی، سلاست، صفائی، جدت اور رقت کی وہی خصوصیات نمایاں ہیں جن کا مطالعہ جمیل کی شاعری میں کیا جاچکا ہے۔ جمیل کی طرح قیس نے بھی پوری زندگی لبنیٰ کے سوا کسی اور سے محبت نہیں کی اور جدائی کے باوجود وہ اس کی محبت کو دل سے نکالنے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ چنانچہ وہ اپنی دلی کیفیات کا اظہار اس طرح کرتا ہے:۔

لقد خفت أن لا تقنع النفس بعدها   بشئ من الدنیا وأن کان مقنعاً

مجھے ڈر ہے کہ اسکی جدائی کے بعد دنیا کی کوئی چیز بھی میرے دل کو قرار وسکون نہیں دے سکتی خواہ اسکے اندر دوسروں کیلئے قرار موجود ہو۔

الی اللہ أشکو فقد لبنیٰ کما شکا   الی اللہ فقد الوالدین یتیم

میں لبنیٰ کے کھو جانے پر اللہ تعالیٰ کے حضور اسی طرح فریاد کر رہا ہوں جسطرح کہ ایک یتیم اپنے والدین کی جدائی پر کرتا ہے۔[4]

أفی الحق ھذا أن قلبک فارغ   صحیح وقلبی فی ھواک سقیم

کیا یہ سچ ہے کہ اس جدائی کے باوجود تمہارا دل مطمئن اور پرسکون ہے وہ نہیں ایسا نہیں ہوسکتا جبکہ میرا دل تمہارے عشق میں بیمار ہوچکا ہے۔

نھاری نھار الناس حتی اذا بدا   لی اللیل ھزتنی الیک المضاجع

۱ وفیات الاعیان۔ ابن خلکان۔ ج ۲ ص ۱۳۲۔

دن کا وقت تو لوگوں کے ساتھ گذر جاتا ہے یہاں تک کہ جب رات آتی ہے تو تمہاری یاد مجھے کسی کروٹ چین نہیں لینے دیتی۔

لقد رسخت فی القلب منک مودۃ   کما رسخت فی الراحتین الاصابع[1]

تمہاری محبت میرے دل میں اسی طرح راسخ ہوچکی ہے جسطرح کہ انگلیاں دونوں ہتھیلیوں کے درمیان راسخ ہوتی ہیں۔

قیس بن ملوح

قیس بن ملوح بھی عذری مکتبۂ فکر کا نمائندہ شاعر ہے۔ لیلیٰ بنت سعد نام کی لڑکی سے اس کو عشق تھا۔ اس کے جنون کی حد تک بڑھ جانے کی وجہ سے اس کا لقب مجنوں پڑ گیا تھا۔ اس کی وفات بھی ۸۰ ہجری میں ہوئی۔[2] اس کی داستان عشق کی تفصیل تاریخ کی کتابوں میں درج ہے۔ قیس کا تعلق قبیلہ بنو عامر سے تھا۔ اس قبیلے میں لیلیٰ نام کی ایک لڑکی تھی۔ دونوں بچپن میں ایک ساتھ مویشیاں چرایا کرتے تھے۔ یہیں سے ان کی محبت کی داستان شروع ہوتی ہے۔ جوانی کے مرحلے میں داخل ہونے کے بعد دونوں کی آزادانہ ملاقات پر پابندی لگادی گئی۔ پھر قیس کے ساتھ مزید ظلم یہ کیا گیا کہ لیلیٰ کے خاندان والوں نے اس کی شادی کسی اور کے ساتھ کردی۔ اس کے بعد قیس نے آبادیوں کو چھوڑ کر ریگستانوں اور ویرانوں کو اپنا مسکن بنالیا اسی طرح صحرانوردی کرتا ہوا اس دنیا سے ناکام ونامراد کوچ کر گیا۔[3] اسکے غزلیہ اشعار میں بھی طہارت، عفت، پاکیزگی، سادگی، روانی، رقت اور اثر پذیری کی خصوصیات نمایاں ہیں۔ وہ اپنی بے بسی اور مجبوری کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

انی لاخشی أن أموت فجأۃ   وفی النفس حاجات الیک کما ھیا

مجھے اندیشہ ہے کہ میں اچانک اس دنیا سے مرجاؤں اور تم سے حال دل سنانے کی خواہش دل ہی میں باقی رہ جائے۔

وانی لینسینی لقاؤک کلما   لقیتک یوماً أن ابثک ما بیا

جب کبھی میں تم سے ملا تو تمہاری ملاقات سے میرے اوپر کچھ ایسی کیفیت طاری ہوئی کہ میں تم سے اپنا راز دل نہ کہہ سکا۔

۱ الغزل منذ نشأتہ حتی صدر الدولۃ العباسیہ ج ۱ ص ۵۰۔ ۲ الاعلام ج ۵ ص ۲۰۸۔ ۳ وفیات الاعیان ج ۲ ص ۱۳۷۔

وما بی اشراک و لکن حبہا کعد السنجا اعیا الطبیب المداویا

لیکن تمھاری محبت اس ناسور کی طرح ہے جس کا علاج کسی طبیب کے بس سے باہر کی چیز ہے۔

أحب من الاسماء ما وافق أسمہا وأشبعہ أو کان منہ مدانیا[1]

مجھے ہر اس بشر سے محبت ہے جسکا نام تمھارے نام کیطرح، یا تمھارے نام سے ملتا جلتا یا اس سے کسی طرح کی قربت رکھتا ہو۔

ایک اور مقام پر اپنی پاکیزہ محبت اور دلی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

أروم سلو النفس عنک وما لہا الی أحد الا الیک طریق

تمنے تمھاری یاد کیطرف سے اپنے دل کو موڑنے کی کوشش کی مگر میرا دل تمھارے علاوہ کسی اور کی طرف مائل نہیں ہوا۔

ولو تعلمین الغیب ایقنت أننی حبیب وأنی للحبیب مشوق[2]

اگر تجھے غیب کا علم ہوتا تو جان لیتی کہ میں تجھ سے محبت کرتا ہوں اور میں اپنے محبوب سے ملاقات کرنے کا مشتاق ہوں۔

کثیرؔ بن عبدالرحمٰن | عذری مکتبۂ فکر کا یہ بھی مشہور نمائندہ شاعر ہے اور کثیرؔ عزہ کے نام سے مشہور ہے۔ تذکرے کی قدیم کتابوں میں اس کے عشق و محبت کے واقعات و حکایات بھی تفصیل سے ملتے ہیں۔ کثیرؔ بن عبدالرحمٰن بن اسود بن عامر خزاعی کی روداد زندگی بھی جمیل اور قیس کے حالات سے بہت حد تک ملتی جلتی ہے۔ اس کی تاریخ پیدائش معلوم نہیں ہو سکی غالب گمان یہ ہے کہ ۱۰۵ھ میں اس کی وفات ہوئی۔[3] کثیرؔ مدینہ کا مشہور غزل گو شاعر تھا۔ اس نے بھی جمیل اور قیس کی طرح اپنی زندگی میں صرف ایک لڑکی "عزہ" سے محبت کی۔ عبدالملک بن مروان اس کی شاعرانہ خوبیوں اور ادبی قدر و منزلت کی بنا پر اس کا قدر داں تھا۔[4] بعض تذکرہ نگاروں کا خیال ہے کہ وہ غالی شیعہ تھا۔[5] کثیرؔ کی داستان

---

[1] الغزل منذ نشأتہ حتی صدر الدولۃ العباسیہ ص ۲۷ [2] حدیث الاربعاء ج ۱ ص ۹۱ [3] الاعلام ج ۵ ص ۲۱۹

[4] کتاب الاغانی ج ۱۱ ص ۲۳ [5] وفیات الاعیان ج ۲ ص ۲۳۳۔

عشق کا لب لباب یہ ہے کہ وہ اپنی بھیڑوں کی گلہ بانی کرتا تھا۔ ایک روز وہ اپنی بھیڑوں کو چرا رہا تھا کہ کچھ لڑکیوں کا ادھر سے گذر ہوا۔ انھوں نے "عزہ" نام کی ایک لڑکی کو کثیرؔ کے پاس مینڈھا خریدنے کے لیے بھیجا۔ وہ لڑکی اسے بہت اچھی لگی۔ اس نے اسے مینڈھا دیدیا جس سے وہ بہت خوش ہوئی اس کے بعد دونوں ایک دوسرے سے کسی نہ کسی بہانے سے ملتے رہے۔ پھر رفتہ رفتہ دونوں ایک دوسرے کی محبت میں جنون کی حد تک آگے بڑھ گئے عزہ کے خاندان والوں نے دونوں کی ملاقات پر پابندی لگا دی جس کے بعد کثیرؔ اپنے اشعار میں اس کے ساتھ تشبیب کرنے لگا۔ سوزش عشق میں اس کی حالت اس وقت اور بھی دگرگوں ہوگئی جب اس کی شادی کسی غیر سے کر دی گئی۔[1] اس کے اشعار کے اندر بھی صداقت، عفت، پاکیزگی، سادگی، روانی، صاف گوئی اور اسلامی تعلیمات کا لحاظ جیسی خصوصیات موجود ہیں جو عذری مکتبۂ فکر کے دیگر شعرا کی خصوصیت ہے۔ کتاب الاغانی اور تذکرے کی دوسری کتابوں میں اس کے اشعار کثرت سے بکھرے پڑے ہیں۔ کثیرؔ کے رنج والم کا اندازہ ان اشعار سے کیا جا سکتا ہے۔

وما کنت ادری قبل عزۃ ما البکا ولا موجعات القلب حتی تولت

میں عزہ کی جدائی سے قبل یہ نہیں جانتا تھا کہ آنسو کیا ہوتے ہیں۔ یا دلی رنج و قلق کسے کہتے ہیں؟

فقلت لہا یا عزۃ کل مصیبۃ أذا وطنت یوما لہا النفس ذلت[2]

میں نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا اے عزہ! ہر مصیبت و مشکل خواہ وہ کتنی بڑی ہو اگر نفس کو اسکے لیے تیار کر لیا جائے تو آسان ہو جاتی ہے۔

ایک دوسری جگہ اپنی محبت، وفا اور خلوص کا اظہار کرتے ہوئے کہتا ہے:۔

---

[1] خزانۃ البغدادی ج ۲ ص ۳۸۱ [2] کتاب الشعر والشعراء ابن قتیبہ۔ احمد محمد شاکر ج ۱ ص ۴۹۵ (پورا قصیدہ)

لا تغدرن بوصل عزة بعد ما أخذت عليك مواثقا وعهودا

عزہ سے بے وفائی اور اس کی ملاقات کی ہرگز غفلت نہ برتنا جبکہ اس نے تمہارے ساتھ محبت اور دوستی کے عہد و پیمان باندھے ہیں۔

أن المحب اذا احب حبيبه صدق الصفاء وانجز الموعودا

جب کوئی کسی سے محبت کرے تو اسکی دوستی میں خلوص اور وعدے میں وفا کے جذبے کا ہونا بہت ضروری ہے۔

لو يسمعون كما سمعت كلامها خروا لعزة ركعا و سجودا

کاش یہ لوگ عزہ کی گفتگو کو سن پاتے جس طرح کہ میں سنتا ہوں تو یہ لوگ عزہ کے روبرو سربسجود ہو جاتے[1]

اباحی شاعری حضرت عمرؓ کے انتقال کے بعد مسلمانوں میں خوابیدہ جاہلی جذبات پرورش پانے لگے۔ اسلامی تعلیمات اور اخلاقی حدود و قیود سے آزادی کا رجحان نمایاں ہونے لگا اسکے نتیجے میں شعرا کا ایک ایسا گروہ پیدا ہوا جو جاہلی شاعری کی خصوصیات کو پھر اپنے اشعار میں جگہ دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اموی دور میں اسی رجحان کے مزید پنپنے اور پروان چڑھنے کی صورت میں اباحی غزل گوئی کا آغاز ہو گیا، غزل گوئی کی اس قسم میں عشق و محبت کے جذبات کے اظہار میں اخلاقی اصول اور شرعی حدود کا کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا تھا۔ اس نقطۂ نظر کے اکثر شعراء کا تعلق مکہ اور مدینہ سے تھا۔ خلافت راشدہ کے خاتمہ کے بعد ان شہروں کی مرکزیت ختم ہو گئی تھی اور تعیش کے اسباب جمع ہو گئے تھے اور عجمی افکار و اثرات کی کارفرمائی تھی۔

ان حالات میں وقت گزاری کے لیے لوگوں نے غزل گوئی شروع کر دی۔ اس دور میں مدینہ کے اندر غنا کو بھی ترقی ملی۔ گائے جانے والے زیادہ تر اشعار اباحیت پسند شعرا کے کلام سے لیے جاتے تھے۔ غزل گوئی کی اس قسم کا بانی عمر بن ابی ربیعہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ غزل گوئی کی اس قسم کو عمری غزل گوئی بھی کہتے ہیں۔ عمر کا ذکر آگے آرہا ہے۔ (باقی)

---

[1] کتاب الاغانی ج ۸، ص ۳۲۔

معارف کی ڈاک

مکتوب لاہور

لاہور ۱۹ دسمبر ۱۹۹۰ء

مکرمی و محترمی زاد فضلکم

السلام علیکم۔ نومبر کا معارف بڑے انتظار کے بعد ملا۔ آپ کی خیر و عافیت سے آگاہی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔

پچھلے ماہ ہمیں حکومت ترکیہ کی وزارت اوقاف (ترکیہ دیانت وقفی) کی جانب سے ترکی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (اسلام انسائیکلوپیڈیاسی) کی دو جلدیں موصول ہوئیں۔ اس انسائیکلوپیڈیا میں دو۔ ڈھائی درجن کے قریب ترک فضلاء شامل ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ان میں اردو داں فضلا بھی ہیں۔ افسوس ہے کہ یہ دونوں جلدیں رومن رسم الخط میں ہیں، لیکن عنوانات عربی حروف میں بھی ہیں، جن سے مشمولات کا پتا چلایا جا سکتا ہے۔ چونکہ رومن رسم الخط میں عربی کے حرف عین کو A سے لکھا جاتا ہے، اس لیے ان جلدوں میں الف کے علاوہ حرف عین سے شروع ہونے والے اسماء اعلام اور مقامات پر بھی مقالات آگئے ہیں۔ سب سے پہلے اسم اعظم یعنی اللہ پر مبسوط مقالہ ہے۔

ہندوستانی مشاہیر علماء میں حضرت سید احمد شہیدؒ، مولوی عبدالباری فرنگی محلی، مولوی عبدالحئی حسنی (والد ماجد مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) شاہ عبدالعزیز دہلوی، علامہ

عبدالعزیز میمن، عالم گیریہ (فتاویٰ) اور شہر الہ آباد پر گرانقدر مقالات ہیں۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی، مولوی عبدالحئی (فرنگی محلی) اور ملا عبدالحکیم سیالکوٹی پر مضامین اگلی جلدوں میں آئیں گے۔

معاصر عرب علما میں قاضی احمد محمد شاکر، قاری عبدالباسط، شیخ عبدالقادر عودہ، عباس محمود العقاد اور علامہ فاسی پر اچھے مقالات ہیں اور ان کے فوٹو بھی شامل ہیں۔ مساجد، مقابر اور محلات کی تصویریں نہایت دیدہ زیب ہیں۔ ترک خطاطوں کی خطاطی کے دلکش نمونوں کی نزاکت اور حسن بیان سے باہر ہے، بالخصوص قرآن پاک کے قلمی نسخوں کے بعض اوراق کا عکس دیکھ کر آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا ہوتا ہے خوشی کی بات ہے کہ ترکی انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے کارپردازوں کے پیش نظر ہمارا اردو دائرہ معارف اسلام بھی ہے اور اس کے حوالے جابجا آئے ہیں۔

این میری شمل جرمنی کی مشہور مستشرقہ ہیں اور برس ہا برس ترکی میں مقیم رہی ہیں۔ انھوں نے آج سے کئی سال پیشتر اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ جنگ عظیم دوم (۱۹۴۵ء) سے ترکی میں احیائے اسلام کی تحریک بڑی تیزی سے پھیل رہی ہے، جبکہ فکری سرمایہ حضرت مجدد صاحب کے مکتوبات اور علامہ اقبال کے کلام کے ترکی تراجم ہیں۔ اقبال سے گرویدگی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے مولانا روم کو اپنا مرشد و رہبر مانا ہے اور وہ ان کے ہم قوم یعنی ترک ہیں۔ ان کے علاوہ سعید نورسی کے رسائل بھی بڑے ذوق و شوق سے پڑھے جاتے ہیں۔

موصوفہ مزید لکھتی ہیں کہ اب ترکی میں مسجدیں نمازیوں سے بھری رہتی ہیں، رمضان المبارک میں مسجدوں کی رونق دوبالا ہو جاتی ہے، عید میلاد النبیؐ بڑی دھوم دھام سے

منائی جاتی ہے، ترکی میں قرآن پاک کے حفظ کرنے کا شوق روزافزوں ہے اور اب بیس ہزار کے قریب حفاظ موجود ہیں۔ دیہات اور قصبات میں لاطینی حروف کو شیطانی حروف کہا جاتا ہے۔

ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار (اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی)، جو ترکیہ کی بعض یونیورسٹیوں میں اردو پڑھاتے رہے ہیں، بتلاتے ہیں کہ ترکیہ کی آرکائیوز (محافظ خانوں) میں تحریک خلافت کے بارے میں جتنا وافر مواد موجود ہے، اتنا خود ہندوستان میں بھی نہ ہوگا، چنانچہ ایک ترک فاضل نے تحریک خلافت پر بڑی تحقیق سے کتاب لکھی ہے۔ مولانا شبلیؒ کی تصانیف کا دوبارہ ترجمہ اردو سے براہ راست ترکی کے موجودہ رسم الخط میں ہو رہا ہے۔

قبرص کے مسئلے پر اقوام یورپ کی جانب سے یونانیوں کی تائید و حمایت اور ترکی سے مخاصمت نیز یورپی مشترکہ اقتصادی منڈی میں ترکیہ کی شمولیت کی مخالفت نے ترکوں کی آنکھیں کھول دی ہیں اور وہ اسلام کی طرف تیزی سے راغب ہو رہے ہیں۔

افسوس ہے کہ یہ خط بلا قصد طویل ہو گیا ہے کیونکہ ایک بات سے دوسری بات نکلتی گئی ہے، جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

رفقاء کی خدمت میں سلام عرض کر دیں۔ اللہ تعالیٰ آپ سب کا حافظ و ناصر ہو اور دارالمصنفین کو ہر آفت و بلا سے محفوظ رکھے۔ خط کی رسید سے ضرور اطلاع دیں۔

فقط والسلام

نیازمند

(الشیخ) نذیر حسین

ادبیات

فریاد

(بین الاقوامی حالاتِ حاضرہ سے متاثر ہوکر)

از

جناب محمد عبدالرحمٰن سعید صدیقی۔ شکاگو

گلوئے ابنِ آدم پر یہ تیغِ خوں فشاں کبتک — اٹھے گی بزمِ گیتی سے صدائے الاماں کبتک

رہیگا عالمِ اسلام زیرِ امتحاں کب تک — الٰہی سینۂ بریاں سے اٹھے گا دھواں کبتک

الم انگیز قصہ بابری مسجد کا اقصیٰ کا — دیارِ پاک کی یہ داستانِ خونچکاں کبتک

فلسطیں، قبلۂ اول اور پھر کشمیر کو رو ؤں — بہیں گی خطۂ کابل میں خوں کی ندیاں کبتک

عرب کی سرزمیں اور عیسوی لشکر معاذ اللہ — رہیں گے زد میں اعدا کی حرم کے پاسباں کبتک

رواداری نہ صلح و آشتی نے ذکرِ الفت کا — جلے گا نفرتوں کی آگ میں ہندوستاں کبتک

الٰہی صحنِ عالم قتل گاہ ۔۔۔ عام ہے گویا — یہ طوفانِ الم کیسا یہ سیلابِ فغاں کبتک

وہ مومن جو کبھی تقدیرِ یزداں بن کے اٹھتا تھا — رہے گا کشتۂ آلام و جورِ آسماں کبتک

اٹھ اے غافل محاذِ حق پہ اب باطل کی یورش ہے — یہ فکرِ خویش اور اہل و عیال و خانماں کبتک

ہراس و یاس و حسرت کفر ہے دین و شریعت میں — یقیں سے کام لے ناداں تو مغلوبِ گماں کبتک

اس عہدِ مظلمہ کی خیر سے یارب سحر کر دے

دلوں میں عزم اور فریاد میں میری اثر بھر دے

مطبوعات جدیدہ

تفسیر نظام القرآن

مولفہ علامہ حمید الدین فراہیؒ مترجمہ مولانا امین احسن اصلاحی

تقطیع کلاں، کاغذ، کتابت و کتابت عمدہ، صفحات ۵۳۶ مجلد مع خوبصورت گرد پوش،

قیمت ۱۰۰ روپیے، پتے: (۱) دائرہ حمیدیہ مدرستہ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڈھ، یوپی۔

(۲) ادارہ علوم القرآن، سر سید نگر، علی گڑھ،

ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہیؒ مدۃ العمر قرآن مجید میں غور و فکر فرماتے رہے، انھوں نے اس کے علوم و معارف کے مختلف پہلوؤں پر متعدد اہم اور بلند پایہ کتابیں یادگار چھوڑی ہیں گو ان کی اکثر تصنیفات ناتمام ہیں تاہم یہ سب بلا استثنا قرآن مجید میں ان کے گہرے غور و فکر کا نتیجہ اور قرآنی اسرار و حکم کا گنجینہ ہیں مولانا نے نظام القرآن کے نام سے قرآن مجید کی ایک عظیم الشان تفسیر بھی لکھنی شروع کی تھی مگر ابھی وہ چند سورتوں ہی کی تفسیر مکمل کر سکے تھے کہ داعی اجل کا پیام آگیا، مولانا کو اردو، فارسی، انگریزی، عربی اور عبرانی زبانوں پر عبور تھا لیکن انھوں نے اپنی قرآنی تصانیف کے لیے دنیائے اسلام کی معروف اور اصل زبان عربی کو وسیلہ بنایا تھا، ان کی زندگی میں ان کی تفسیر کے جو اجزا مرتب ہو گئے تھے ان میں سورہ اخلاص کے علاوہ سب عربی میں تھے اور علی گڈھ اور دار المصنفین اعظم گڈھ سے یہ شایع ہوئے تھے، ان کی وفات کے بعد جب ان کی یادگار میں دائرہ حمیدیہ قائم ہوا تو ان کے شاگرد اور علمی جانشین مولانا امین احسن اصلاحی نے عربی کے تفسیری اجزا کا

سلیس و شگفتہ اردو ترجمہ کیا جو وقتاً فوقتاً متفرق طور پر وہیں سے شایع ہوتا رہا، کئی برس پہلے مولانا امین احسن صاحب نے اپنے استاذ کے اجزائے تفسیر کے اردو ترجمہ کا ایک مجموعہ اپنے فاضلانہ مقدمہ کے ساتھ پاکستان سے شایع کیا تھا جس کی اشاعت کی ضرورت ہندوستان میں بھی شدت سے محسوس کی جارہی تھی تاکہ مولانا کے اصول تفسیر اور طریقہ تدبر قرآن کو جاننے اور سمجھنے کی راہ ہموار ہو۔ الحمد للہ کہ اب دائرہ حمیدیہ نے اس اہم اور ضروری کام کی طرف توجہ مبذول کرکے مولانا کے اجزائے تفسیر کا یہ اردو مجموعہ شایع کیا ہے جس پر وہ مبارکباد کا مستحق ہے، اس مجموعہ میں حسب ذیل تفسیری اجزا شامل ہیں، مقدمہ تفسیر نظام القرآن، تفسیر آیہ بسم اللہ، تفسیر سورۂ فاتحہ، تفسیر سورۂ ذاریات، تفسیر سورۂ تحریم، تفسیر سورۂ قیامہ، تفسیر سورۂ مرسلات، تفسیر سورۂ عبس، تفسیر سورۂ شمس، تفسیر سورۂ والتین، تفسیر سورۂ والعصر، تفسیر سورۂ فیل، تفسیر سورۂ کوثر، تفسیر سورۂ کافرون، تفسیر سورۂ لہب اور تفسیر سورۂ اخلاص، مولانا کا طریقۂ تفسیر یہ ہے کہ وہ پہلے سورتوں کا عمود (بنیادی مضمون) اور ان کا ماقبل و مابعد کی سورتوں سے ربط و تعلق بیان کرتے ہیں پھر طویل سورتوں کے مختلف اجزا کے لفظوں کی تحقیق، مشکل جملوں اور فقروں کی وضاحت و تحقیق نیز سورہ کے مختلف اجزا کے باہمی تعلق کی تشریح کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں سلسلۂ آیات میں جو اہم حقائق و مطالب اور دلائل و شواہد بیان کیے گئے ہیں ان پر پوری دقت نظر سے عالمانہ بحث کرتے ہیں، غرض کوئی سورہ ایسی نہیں ہے جس کی تفسیر میں حضرت مولانا نے اہم حقائق و اسرار کی نشاندہی نہ کی ہو، جن مقامات سے مفسرین سرسری گزر گئے ہیں، مولانا کے ذہن رسا اور نکتہ سنج دماغ نے نکتہ آفرینیوں اور دقیقہ سنجیوں کے انبار لگادیے ہیں۔ اس مجموعہ کی قدر

و قیمت کا اندازہ مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے، معارف میں متعدد بار ان پر تبصرے لکھے جاچکے ہیں، مجموعہ کی خاص چیز اس کا مقدمہ بھی ہے جس سے مصنف علامؒ کی تفسیر کے اہم اصول اور ان کے فہم و تدبر قرآن کے متعلق بہت سی اصولی اور مفید باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ اور آیہ بسم اللہ اور تفسیر سورۂ فاتحہ اگرچہ نامکمل ہیں تاہم ان کے اور دوسرے اجزائے تفسیر کے مطالعہ سے قرآن مجید کے طلبہ کو بڑی رہنمائی ملے گی اور قرآنی حقایق و اسرار کے نئے پہلو اور اس میں غور و فکر کی مختلف راہیں سامنے آئیں گی۔ شروع میں فاضل مترجم کے قلم سے ایک عالمانہ تحریر میں ان اجزائے تفسیر کے بارے میں بہت سی ضروری اور مفید باتیں بیان کی گئی ہیں اور مولانا کی تفسیر کے اصول و نہج کو بھی واضح کیا گیا ہے، انھوں نے ارتجالاً فاضل مصنف کے جو جامع و مرتب حالات و سوانح تحریر کیے ہیں ان سے ان کی عظمت و کمال کا مرقع سامنے آجاتا ہے، مولانا فراہیؒ کی تفسیر کا اصل اور پورا نام تفسیر نظام القرآن و تاویل الفرقان بالفرقان ہے لیکن ناشر نے صرف نصف نام دینے پر اکتفا کیا ہے۔ ثانیاً مصنف کا معمول یہ تھا کہ وہ اپنی کتابوں پر اپنا نام المعلم عبد الحمید الفراہی لکھتے تھے لیکن اس مجموعہ میں ان کا نام علامہ حمید الدین فراہی درج کیا گیا ہے۔ یہ مجموعہ معنوی خوبیوں سے قطع نظر ظاہری نفاست اور حسن طباعت کے لحاظ سے بھی دلکش ہے۔

التکمیل فی اصول التاویل (عربی) تالیف العلامہ عبد الحمید الفراہیؒ تقطیع کلاں، کاغذ عمدہ خوبصورت ٹائپ صفحات ۷۰، قیمت ۲۰ روپیے پتہ: دائرہ حمیدیہ مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڈھ۔

یہ کتاب بھی ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہی کی قرآنی بصیرت اور ان کے وسیع و عمیق مطالعہ قرآنی کا نچوڑ ہے جو دراصل مولانا کی تفسیر نظام القرآن کا مقدمہ ہے۔

کئی برس پہلے ہندوستان میں مولانا کے علوم و افکار کے وارث و ترجمان مولانا بدرالدین اصلاحی ناظم دائرہ حمیدیہ نے اپنے پرمغز مقدمہ کے ساتھ اسے شایع کیا تھا، اب اسکا یہ دوسرا اڈیشن بھی اہتمام سے چھپا ہے، اس میں مصنف نے قرآن مجید کے تاویل کے وہ اصول وضوابط قلمبند کیے ہیں جو اس کے لفظوں کی اصل مراد اور صحیح مفہوم کی تعیین کرتے ہیں اور گوناگوں احتمالات اور غلط و باطل تاویلوں کو ختم کرکے قرآن کے اصل مفہوم اور متعین تاویل کی جانب رہبری کرتے ہیں، شروع میں مصنف نے اصول تاویل کو منضبط کرنے کی ضرورت واہمیت اور اس کے فوائد و مقاصد بتائے ہیں اور اس کی جانب سے علمائے فن کی بے توجہی کا ذکر کرکے اس کے نقصانات بھی دکھائے ہیں، تاویل کی حقیقت و مفہوم بیان کرکے تفصیل و تحریف سے اس کا فرق واضح کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ قرآن مجید قطعی الدلالت ہے جو گوناگوں احتمالات کے بجائے ایک ہی مفہوم و مدلول پر دلالت کرتا ہے اور آخر میں جن اصول کی تشریح کی ہے وہ تین طرح کے ہیں (۱) اصلی (۲) مرجح (۳) اور ظنی، ان مباحث اور ان کے ضمن میں مولانا نے جو دقیق اور عالمانہ بحث کی ہے اس کی خوبیوں کا اندازہ مطالعہ کے بعد ہی ہوگا۔

ظہور قدسی از مولانا عبدالجبار خاں رہبر اعظمی، تقطیع خورد، کاغذ، کتابت وطباعت قدرے بہتر، صفحات ۴۲، قیمت درج نہیں، پتہ: جامعہ المجددیہ، مقام و پوسٹ خالص پور ضلع اعظم گڈھ۔

مولانا احمد رضا خاں بریلوی مرحوم بڑے صاحب علم و کمال شخص اور اچھے نعت گو شاعر تھے، زیر نظر طویل نظم ان کے مشہور سلام ع مصطفےٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام پر تضمین ہے، مخصوص عقائد و خیالات سے قطع نظر نظم سے تضمین نگاری کی فن پر قدرت اور حسن بیان کا اندازہ ہوتا ہے۔

"ض"